حمید نظامی

حمید نظامی

[ایک مطالعہ، ایک تجزیہ]

○

شورش کاشمیری

مطبوعات چٹان لاہور

فروری ۱۹۶۷ء

ناشر ——— مطبوعات چٹان لمیٹڈ۔ لاہور

طابع ——— چٹان پرنٹنگ پریس ۔ لاہور

قیمت ——— دو روپے پچیس پیسے،

بار اوّل ——— ایک ہزار

کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے یارب
اِک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

غالبؔ

لمحۂ فکریہ،

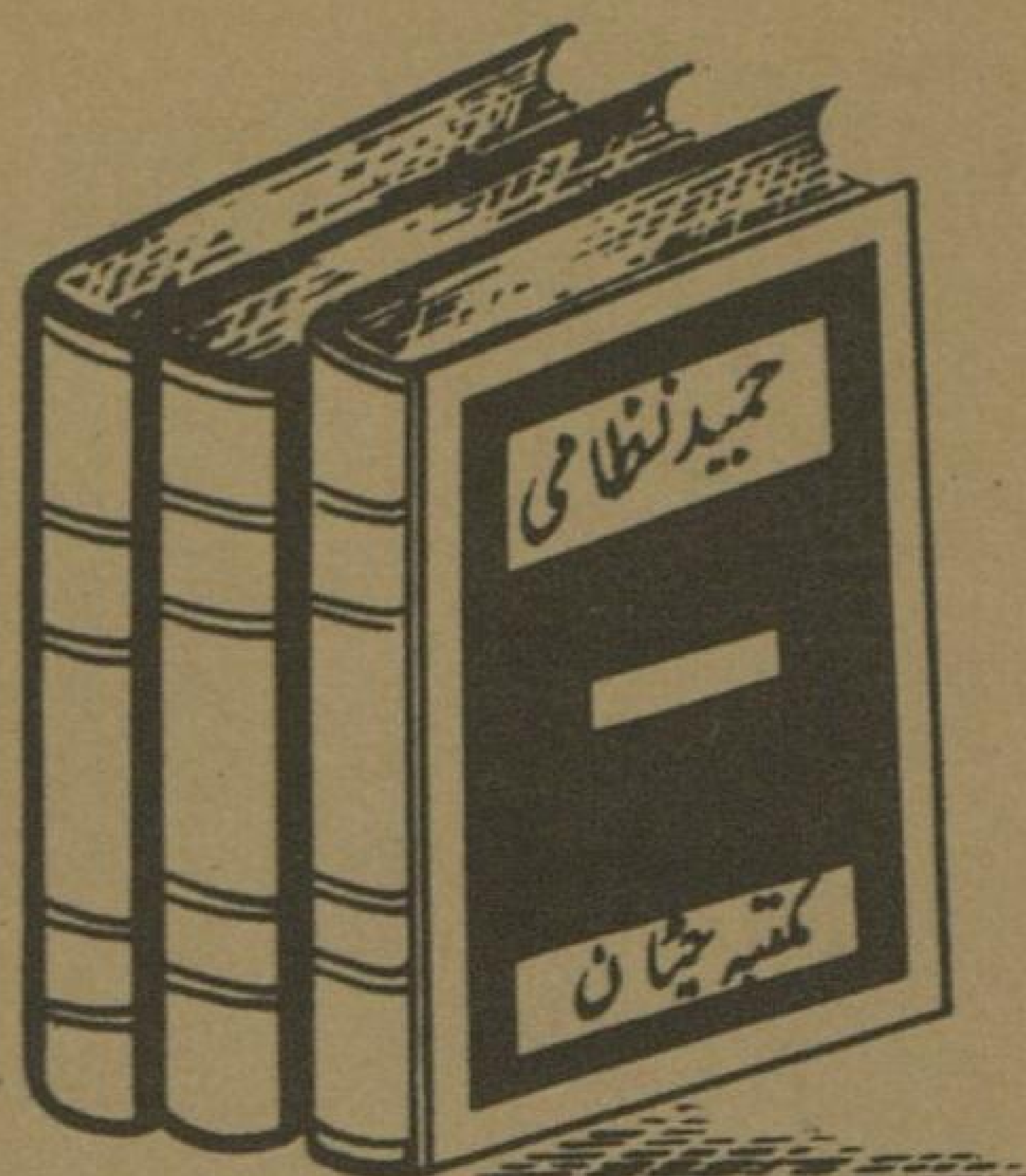
بیشتر لوگ زِندگی ہی میں مر جاتے ہیں،
لیکن کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی زِندہ
رہتے ہیں، اور ان کی حیاتِ مستعار آئندہ
نسلوں کے لئے نشانِ راہ بن جاتی ہے

●

ڈاکٹر مبشّر حسن

کے

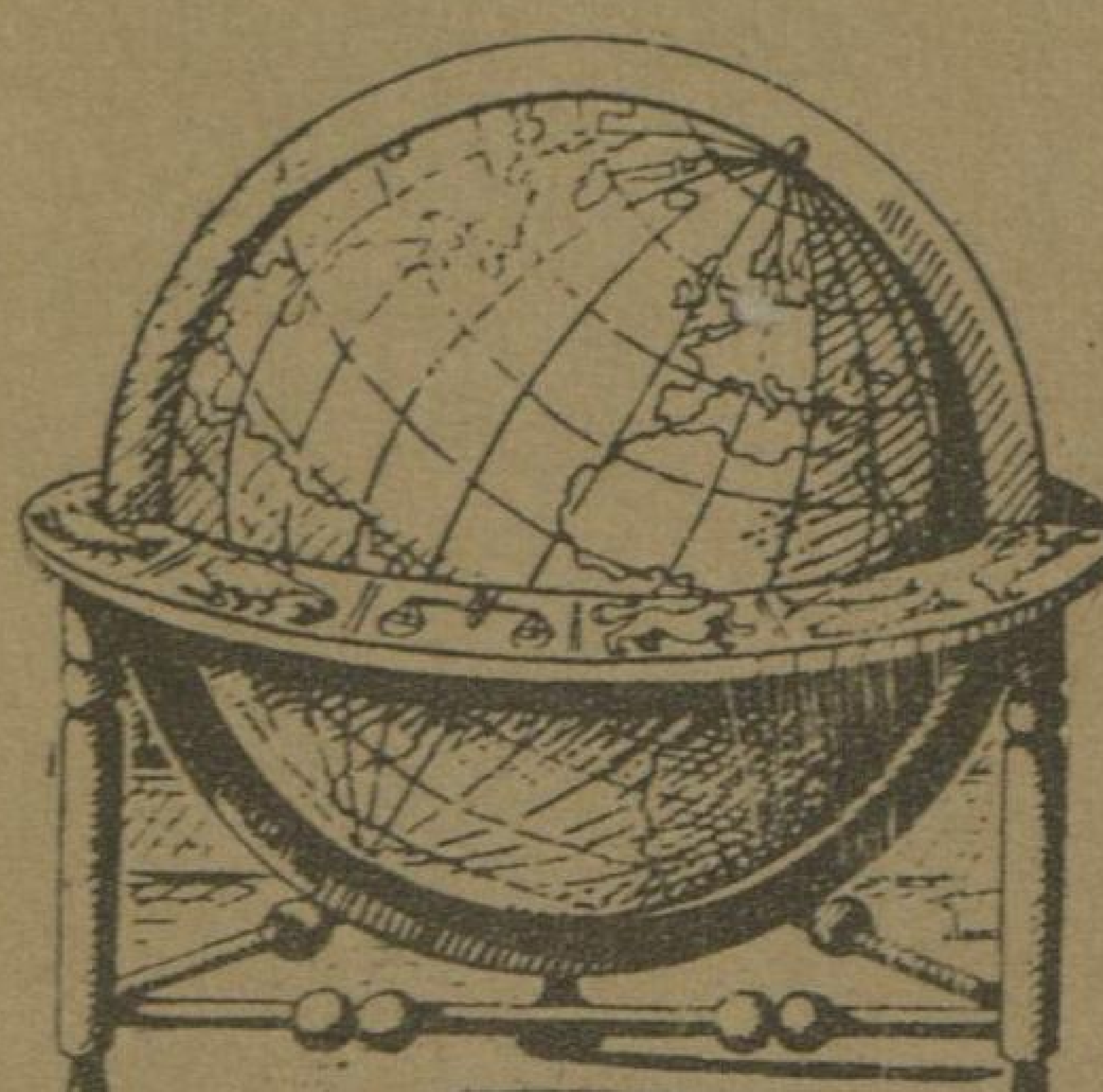
نام



مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ - لاہور



لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے



اِبتدائیہ

آغا شورش کاشمیری ایک صحافی، ادیب، شاعر، خطیب اور سیاسی کارکن کی حیثیت سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی جوانی میں برصغیر کی جدوجہدِ آزادی میں عملی حصّہ لیا اور اپنی عمرِ عزیز کا کافی حصہ غیر ملکی حکمرانوں کے جیلوں میں کاٹا۔ ان کے ابتدائی سیاسی نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، ان کی ذات تنقید و اعتراضات کا موضوع بھی بنی رہی اور اب بھی ان کے بعض کرم فرما انہیں کبھی کبھار "خصوصی نوازشات" کا مستحق خیال کرتے ہی رہتے ہیں۔ مسائل حاضرہ پر تبصرہ کرتے وقت آغا شورش کبھی کبھی ایک خاص رخ اختیار کر لیتے ہیں جس پر خود راقم الحروف نے ان کے سامنے کئی بار گستاخیاں کی ہیں اور انہوں نے ساری باتیں خندہ پیشانی سے سُنی ہیں۔ لیکن آغا صاحب کی قربانیوں اور ادب، سیاست اور صحافت کے لئے ان کی خدمات کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے شخصیات کو پرکھنے کے معیار دوسری معاشرتی اقدار کی طرح اب بڑی تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔ زبان سے تو ہمیشہ یہی کہا جا رہا ہے کہ اس ملک کی فلاح و استحکام کے لئے

متوسط طبقہ کی پذیرائی ضروری ہے لیکن یہ متوسط طبقہ کم از کم مغربی پاکستان میں ہمیشہ با اثر متمول طبقہ کا آلہ کار اور دریوزہ گر ہی بنا رہا ہے۔ سابق پنجاب کی تاریخ میں ایسے مراحل بھی آئے جب متوسط طبقہ کے افراد کو حکومت اور حکمران جماعت میں ذمہ دار عہدوں پر فائز ہونے کا موقعہ ملا۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ ان اصحاب کو کبھی اپنے سرپرستوں کی مصلحتوں سے ہٹ کر سوچنے اور عمل کرنے کی بھی توفیق ہوئی ہو۔ اس کے ساتھ یہ افسوسناک حقیقت بھی دیکھنے میں آئی کہ اگر کوئی غریب نوجوان اپنی محنت اور خلوص کے ساتھ آگے بڑھنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے بڑے طبقہ کی خوشامد کرنے کی بجائے اعلائے کلمۃ الحق کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تو متوسط طبقہ نے بھی اسکی مخالفت اور مذمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ میرے استاد حمید نظامی مرحوم کی مخالفت بھی اکثر ان کے عروج اور عظمت سے حسد ہی کا نتیجہ رہی ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے فرعونوں کو چیلنج کیا۔ بڑے تند و تیز طوفانوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ابتدائی دور میں حکمرانوں نے ان کی حق گوئی سے پریشان ہوکر انہیں وزارتوں اور دوسرے عہدوں کی بھی پیشکش کی۔ لیکن جب وہ ترغیب و تحریص کے سارے حربے آزما چکے اور ان میں ہر طرح ناکام رہے تو انہوں نے نظامی مرحوم کے طبقہ ہی سے تعلق رکھنے والے پرانے کاسہ لیسوں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ یہ لوگ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ بکاؤ مال سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے انہوں نے مرحوم پر ایسے ایسے طومار باندھے کہ تہذیب و شرافت ماتم کناں نظر آئی۔ لیکن سب ستم

کی اس مہم کا اثر اور نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ مرحوم حمید نظامی کی عظمت دلوں میں راسخ تر ہوتی گئی۔ شورش صاحب کی اپنی مخالفت بھی اکثر اسی وجہ سے ہوئی ہے کہ جن لوگوں نے انہیں بیس اکیس برس پہلے ایک غریب و بے آسرا نوجوان کی حیثیت سے دیکھا تھا انہیں اب ان کی خوشحالی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ہمارے دلوں میں آغا شورش کا احترام اس لئے بھی ہے کہ وہ قیام پاکستان کے بعد آزادیٔ صحافت کی ایک علمبردار شخصیت — جناب نظامی مرحوم کے حلقہ احباب میں آخری دم تک شامل رہے۔ چنانچہ مرحوم پر کچھ لکھنا آغا صاحب ہی کا حق تھا۔

اپنی مختصر کتاب کے اختتامیہ میں شورش صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ کوئی باقاعدہ سوانح عمری نہیں، کسی مبسوط کتاب کا حصّہ نہیں اس پر کسی تذکرہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ ہم اسے کہانی کہہ سکتے ہیں اور نہ اس میں افسانوی خوبو پائی جاتی ہے۔ اس میں ایک ایسی داستان کی آمیزش ضرور ہے جو ہمارے سامنے رونما ہوئی۔ پھر اکیلا اکیلی ختم ہوگئی یہ ایک تجزیہ ہے ایک مشاہدہ ہے ایک مطالعہ ہے۔ اس شخص کے بارے میں جو ہمارے سامنے زندگی کے سفر کو نکلا تھا دنوں ہی دنوں میں ممتاز ہوگیا۔ حتیٰ کہ اس کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ شہروں میں اس کی باتیں تحریک بن کر پھیلتی رہیں محلوں میں اس کا خوف مسلط ہوتا گیا میدانوں میں اس کا چرچا رہا، دفتروں میں اس کا ڈنکا بجا، شہریاروں نے اس کی چوٹیں سہیں۔ وزارتوں کو ہدف بننا پڑا، حکومتوں نے رختِ سفر باندھا اور غفرلہ ہوگئیں۔ دوست اس سے پھول چنتے اور دشمن زخم کھاتے رہے۔ اپنے معاصروں میں وہ سب سے کم عمر تھا سب سے آگے

نکل گیا۔ اچانک ستاؤنی آگئی اور وہ واصل بحق ہو گیا"۔۔۔شورش صاحب نے درست کہا ہے کہ یہ کتاب کوئی سوانحعمری نہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ذاتی مجلسوں کی ناقابل فراموش یادیں جس طرح تازہ کی ہیں اور ان میں جس خوبی کے ساتھ اخلاص کی شمعیں روشن کی ہیں۔ اس کے لئے وہ بجا طور پر مستحق مبارکباد ہیں۔ ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو میں سوانحعمری کی صنف نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ حالی، شبلی، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، سید رضا علی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، چراغ حسن حسرت، شورش کاشمیری اور عبدالمجید سالک وغیرہ نے بلاشبہ سوانح نگاری کے لئے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن بعد میں کوئی قابلِ ذکر پیش قدمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ چنانچہ شورش صاحب کو بھی اس ضرورت کا احساس ہے۔ انہوں نے کہا ہے " حمید نظامی کیا تھے اور کیا نہیں؟ یہ بعض دوسرے عقدوں کی طرح ابھی تک گم شدہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ پاکستان نے اپنی تاریخ کب لکھی ہے کہ حمید نظامی پر قلم اٹھائے۔ قائدِ اعظم کے سوانح حیات ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں یار لوگوں نے الفاظ کے کھلونے بکھیر کر مطالب کا مینا بازار لگا دیا ہے۔ حمید نظامی کو اس ویرانۂ آباد میں کون پوچھتا ہے؟"

میری گزارش یہ ہے کہ گو قائدِ اعظم کی زندگی پر ابھی تک کوئی ہر لحاظ سے مستند کتاب نہیں لکھی گئی اور نظامی مرحوم کے متعلق بھی ایسی کوئی کوشش منظرِ عام پر نہیں آئی لیکن اس کوتاہی کے باوجود قائدِ اعظم، دوسرے مشاہیر اور خود مدیرِ نوائے وقت کی عظمت اپنی جگہ قائم ہے اور جوں جوں وقت گزر رہا ہے اس عظمت کے احساس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

ایک ایڈیٹر کی سب سے بڑی یادگار وہ اداریئے ہوتے ہیں جو ہر روز اخبار میں چھپ جاتے ہیں اور یہ اداریئے اب بھی محفوظ ہیں۔ اِن سے پاکستان کی سیاسی تاریخ کے خط و خال فراہم کئے جا سکتے ہیں۔

حمید نظامی مرحوم کے پاسپورٹ کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۳ر اکتوبر ۱۹۱۵ء تھی۔ انہوں نے ۲۵ر فروری ۱۹۶۲ء کو وفات پائی۔ اس حساب سے ان کی عمر وفات کے وقت ۴۶ سال ۴ ماہ ۲۲ دن تھی اور اگر بارہ لیپ کے سالوں کے بارہ دن بھی شمار کر لئے جائیں تو انہوں نے کل عمر ۴۶ سال ۵ ماہ اور چار دن پائی۔ وہ مجھ سے عمر میں چھ سال بڑے تھے۔ میں اپنے آپ میں ایسی کوئی صلاحیت نہیں پاتا کہ شورش صاحب جیسے صاحب طرز ادیب اور صحافی کے رشحاتِ فکر میں کوئی اضافہ کروں اس کے باوجود انہوں نے مجھے ابتدائیہ لکھنے کے لئے غالباً اِس لئے منتخب فرمایا کہ جب سے نوائے وقت جولائی ۴۴ء میں روزانہ اخبار کی حیثیت سے چھپنا شروع ہوا میں بھی نظامی صاحب کا ہمسفر رہا اور ۵۳ - ۱۹۵۱ء میں ڈیڑھ سال کے سوا یہ رفاقت کبھی ختم نہیں ہوئی جولائی ۴۴ء سے قبل نظامی صاحب لاہور میں مسلمانوں کی واحد نیوز ایجنسی اورینٹ پریس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اور ایم اے کرنے کے بعد میں ان کے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔ اس سارے عرصہ میں جو کچھ سیکھا، وہ نظامی صاحب ہی کا فیض ہے ان دنوں صوبہ کا مسلم پریس زیادہ تر یونینسٹوں کی ہاں میں ہی ہاں ملانے کا عادی تھا چنانچہ نظامی صاحب نے مسلمانوں میں صحیح سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے اخبار نکالنے کا فیصلہ

کیا اور یوم اقبال کے موقع پر "نوائے وقت" کا جو پہلا پرچہ جاری کیا اس پر ۲۹ر مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخ تھی۔ اس کی پیشانی پر سرپرست کی حیثیت سے میاں بشیر احمد سیکرٹری انجمن اردو پنجاب کا نام ۱۱ر فروری ۴۱ء تک شائع ہوتا رہا۔ پیشانی پر اقبال کا یہ شعر بھی ہوا کرتا تھا۔ ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

پہلے پرچہ میں اداریہ "نوائے قوم" کے زیرِ عنوان میاں بشیر احمد نے لکھا جسے ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا گیا۔ ـــــ "ہمارے بلند نظر شاعر اور ہمارے محبوب رہنما نے ہمارے مستقبل کی ایک جھلک ہمیں دکھا دی ہے ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

میاں صاحب کے اس مقالہ کے علاوہ کرشن چندر کا افسانہ "آنکھیں"۔ حفیظ ہوشیارپوری کی نظم "دانائے راز"۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مضمون "اقبال اور کالج کی تعلیم"۔ ڈاکٹر محمد باقر کا کالم "اردو سبھا" اور حمید نظامی کا کالم "لیل و نہار" (جو مقالہ سے ملتا جلتا تھا) شائع ہوا۔ نظامی صاحب نے "کچھ اپنے متعلق" کے زیرِ عنوان ادارہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

" . . . . لیکن ہم آپ کو یہ یقین ضرور دلانا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے سامنے

صرف اچھی خبریں پیش کریں گے۔ ہمارے دو سب سے بڑے مقاصد اردو زبان کی ترقی اور علامہ اقبال کے پیغام کی اشاعت ہیں۔ ان کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں ہم اس اخبار کی مدد سے کسی ادبی اور معاشرتی انقلاب کو برپا کر دینے کے مدعی نہیں لیکن ہمیں یہ دعویٰ ضرور ہے کہ ہم آپ کے سامنے اچھا ادب پیش کریں گے۔ ہم نے یہ قدم راستے کی مشکلات پر پوری طرح غور کرنے کے بعد اٹھایا ہے۔ نوجوان ہونے کے باوجود ہم جوشِ فضول کے قائل نہیں۔ ہمارے ارادے بلند ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانا انسان کی ہمت سے باہر ہو۔ آخری گزارش یہ ہے کہ ہمارے کام کا اندازہ لگاتے وقت اتنا خیال رکھیے کہ یہ نوجوانوں کا کام ہے۔

پہلے پرچہ کے صفحہ اوّل پر قائدِ اعظم اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صدر انجمن ترقی اردو اور ساتویں صفحہ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے بیانات و پیغامات کے علاوہ "شاعرِ فردا" کے زیرِ عنوان سر عبدالقادر کا پیغام بھی شائع ہوا۔ نظامی صاحب نے ارادوں کی بلندی کے باوجود جوشِ فضول کے قائل نہ ہونے کی جو وضاحت فرمائی اس مسلک پر وہ کافی عرصہ تک گامزن رہے۔ وہ اردو کی خدمت کے ساتھ علامہ اقبال کے پیغام کو بھی عام کرتے رہے، اور سیاسی میدان میں یہ پیغام دراصل مسلم لیگ کا پیغام تھا اور یہی وہ پیغام تھا جو آگے چل کر مطالبہ پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔ مدیرِ نوائے وقت "مسلم لیگ کے اصولوں کا دم بھرنے والوں پر تنقید کیا کرتے تھے۔ لیکن شروع میں یہ تنقید اپنے دامن میں اس تلخی کی آئینہ دار نہیں تھی جو بعد میں تقاضائے حالات کے تحت ان کی تحریروں کا

طغرائے امتیاز بنی۔ مجھے یاد ہے کہ سر سکندر حیات نے جب ۴۱ء میں لاہور کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے "پاکستان زندہ باد" اور قائد اعظم زندہ باد کے نعرے بلند کرنے والے چند پرجوش طالب علموں کو جلی کٹی سنائیں اور مسلمانوں نے سر سکندر کی اس تقریر کو سخت ناپسند کیا تو نظامی صاحب نے لکھا تھا کہ سر سکندر کے معاملے میں سخت بے انصافی برتی جا رہی ہے انہوں نے بالکل بے ضرر تقریر کی۔ سر سکندر اگر پاکستان کی طرف ایک قدم چلتے ہیں تو پاکستان کے حامی انہیں اپنے ساتھ دس قدم اور آگے لے جائیں نہ کہ یہ کہیں کہ سر سکندر پاکستان کے مخالف اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ نظامی صاحب نے جہاں سر سکندر کی حمایت کی وہاں انہیں یہ مشورہ بھی دیا کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی ذمہ داریاں بھی پوری کریں۔ اس واقعہ کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ اس وقت تک نظامی صاحب یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑنا نہیں چاہیے۔ لیکن رفتہ رفتہ یونینسٹوں کے بارے میں ان کی ساری خوش فہمیاں ختم ہو گئیں اس جماعت نے پھر جب بھی مسلم مفاد سے غداری کی نظامی صاحب نے انہیں کبھی معاف نہیں کیا۔ اگر یہ کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس زمانہ میں نوائے وقت نہ ہوتا تو مسلمانوں کی تحریک اتنے قلیل عرصہ میں انہیں کبھی بھی اپنی منزل مقصود سے ہمکنار نہ کر سکتی انہوں نے اس صوبے کو انگریز حکمرانوں اور افسروں سے نجات دلانے کے لئے جو مہم چلائی اس سے تو اپنے بھی پریشان ہو گئے تھے۔

صحیح صحافت نے ہر دور میں پوری جرأت کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کا حق

ادا کیا ہے۔ چنانچہ نوائے وقت کے علاوہ بعض دوسرے ممتاز اخبارات نے بھی اس نصب العین کی خاطر قربانیاں دی ہیں لیکن نظامی مرحوم کی عظمت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ کسی دور میں بھی حق گوئی و بے باکی کے راستہ سے نہیں ہٹے۔ غیر ملکی حکمرانوں کی زیادتیوں پر احتجاج کے مقابلے میں اپنے حکمرانوں کے جبر و تشدد اور غیر جمہوری کارروائیوں کے خلاف سینہ سپر ہونا زیادہ جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ جب نظامی صاحب نے انگریز، ہندو کانگرس، نیشنلسٹ مسلمانوں اور پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی ملی بھگت کے مقابلہ میں جو کھلی جنگ لڑی تو انہیں مسلم عوام کی تائید حاصل تھی قیام پاکستان کے بعد جب اپنوں کی حکومت قائم ہو گئی اور نئے حکمرانوں نے جمہوریت کی بجائے آمرانہ رجحانات کا مظاہرہ شروع کر دیا اور نڈر حمید نظامی ان چیرہ دستیوں کے مقابلہ کے لئے ڈٹ کر میدان میں آ گئے تو ملک میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یہ کہنے لگے کہ اب اپنی حکومت پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔ انہوں نے یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ اگر کوئی آزاد اخبار اپنوں کی غیر دانشمندانہ کارروائیوں پر چپ سادھ لے تو وہ رائے عامہ کی ترجمانی اور رہنمائی کے فرض منصبی سے عہدہ برآ ہونے کی بجائے ایک مجرمانہ تغافل کا مرتکب ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض دوسرے نو آزاد ملکوں کی طرح یہ المیہ پیش آیا کہ تحریک پاکستان کے آخری مراحل میں جو لوگ حلقہ بگوش ہوئے ان میں سارے مخلص نہیں تھے۔ البتہ وہ بارسوخ ضرور تھے انہوں نے اپنے اثر و رسوخ کی بدولت حکومت میں بھی مقام حاصل کر لیا۔ جب تک قائد اعظم زندہ رہے ان لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع نہ مل

سکا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد انہوں نے پر پرزے نکالے۔ غلط اندیش حکمرانوں نے حکومت کی جائز مخالفت کرنے والوں کو غدار اور کتے تک کے القابات سے نوازا تو کم ظرف لوگوں نے واہ واہ کے ڈونگرے برسائے اور جس اخبار نے اس روش پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اسے نشانۂ انتقام بنانے کا مشورہ دیا۔ نوائے وقت سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے لیکن اس نے حکمرانوں کا احتساب جاری رکھا۔ اس نے مسلم لیگ والوں کی غیر جمہوری کارروائیوں پر انہیں ٹوکا۔ انہیں یاد دلایا کہ اقتدار آنی جانی چیز ہے ملک کے مقابلہ میں افراد کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اور جو اصول ملک کی عظمت کو دوبالا کر سکیں ان کو کچلنے کی بجائے ان کی پاسداری اور ان کی خاطر قربانی پیش کرنا ہی انسان کا سب سے بڑا فرض ہونا چاہیے

اسی دور میں نظامی مرحوم نے جمہوریت کی خاطر اپوزیشن کے وجود کی ضرورت پر زور دیا۔ جن لوگوں نے اٹھارہ بیس برس تک ان کے ساتھ کام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ نظامی صاحب نے اپوزیشن کی حمایت اس انداز سے کبھی نہیں کی کہ اس سے ملک کے مجموعی مفاد کو زک پہنچے۔ مارشل لار کے دور میں جب بڑے بڑے لوگوں کی زبانیں مصلحتوں کے پیش نظر بند ہو گئیں تو نوائے وقت ہی اصل مسائل اور ملکی ضرورتوں کی نشان دہی کرتا رہا۔ اگر آج ملک میں بری بھلی اپوزیشن موجود ہے تو اس کی آواز کو عوام تک پہنچانے میں یہی اخبار مقدور بھر خدمت انجام دے رہا ہے تاہم اگر اسے خوشامد پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہ بھی کہوں گا کہ جہاں قیام پاکستان کے بعد پرانے مسلم لیگیوں نے اس اخبار کو بند کرنے سے بھی گریز نہیں کیا وہاں مارشل لار کے بعد نئے حکمرانوں نے کم از کم اتنی

رواداری کا ثبوت ضرور دیا ہے کہ انہوں نے اخبار کو بند نہیں کیا اور یہ محسوس کیا ہے کہ آزاد صحافت کی اس آخری شمع کا وجود ختم نہیں ہونا چاہیے۔ مرحوم حمید نظامی کی حب الوطنی اور اسلام دوستی شک و شبہ سے بالا تھی۔ وہ پابندیوں کے باوجود اپنی بات کہنے کے ماہر تھے۔ چنانچہ انہوں نے حتی الوسع اعتدال سے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اسی لئے نگاہوں سے میدانِ صحافت کے اس روشن ستارے کے اوجھل ہو جانے پر مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر کیانی نے فرمایا تھا :-

"علامہ اقبال کا — یا — قائدِ اعظم کا ذکر کرتے ہوئے مجھے حمید نظامی یاد آتے ہیں۔ کہتے ہیں دنیا عالم حسرت ہے۔ مثلاً اپنے والد کی آخری بیماری میں جب میں تعطیلات گزارنے کے بعد لاہور آ رہا تھا انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ دن ٹھہر جاؤ اور میں نے عذر کیا کہ ہائیکورٹ جب کھلتا ہے تو چیف جسٹس کو موجود ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی وفات کے وقت میں موجود تھا مگر یہ حسرت دل ہی میں رہی کہ ان کی خواہش پوری نہ کی۔ کچھ اسی طرح کی حسرت حمید نظامی کے متعلق ہے ایسا آدمی جو اعتدال سے بھی نہ بڑھے مگر حد اعتدال پر کھڑے ہو کر افقِ امکان کے بے پایاں حدود دکھا سکے جو نہ لیڈر بننا چاہتا تھا جس کو نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلہ کی پروا۔ ایسا آدمی وہ تھا جواب نہیں ہے"

شورش صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "نوائے وقت نے متبادل لیڈر شپ پیدا نہ کی"۔ میں صرف یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ایک صحافی کا کام متبادل لیڈرشپ پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ وہ ایک سیاسی مفکر ہوتا ہے وہ نظریات پیش کرتا ہے اور ملکی مسائل

پر بے باکانہ تنقید کرتا ہے یہی فرض حمید نظامی مرحوم نے بھی انجام دیا۔ وہ غور و فکر کی غذا مہیا کرتے رہے اور یہ نوائے وقت کا اعجاز تھا کہ ملک میں متبادل قیادت پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا اور اب یہاں ایسے رہنماؤں کی بھی کوئی کمی نہیں جنہوں نے مختلف جماعتوں کی قیادت کرتے ہوئے ملک و قوم کی خدمت کا فرض بجا لانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اب اگر متبادل قیادت خود بے عملی کا شکار رہے تو اس کے لئے نہ وہ حکومت سے گلہ کرنے میں حق بجانب ہے اور نہ اخبارات پر کوئی الزام عائد کر سکتی ہے۔

فاضل مصنّف نے لکھا ہے کہ نظامی صاحب سے معافی پا کر قاتل بھی مقتول ہو جاتا تھا۔ اور انہوں نے لیگ سے شدید اختلاف کے باوصف پرانے اور سیانے مسلم لیگیوں ہی کو مقدم رکھا ــــ میں سمجھتا ہوں کہ اگر نظامی صاحب نے قاتلوں کو بھی معافی دے دی تو یہ کوئی برائی نہیں تھی بلکہ یہ طرزِ عمل ان کی وسیع ظرفی کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔ آخری عمر میں عفو و درگزر کی اس فراوانی سے معلوم ہوتا تھا جیسے نظامی صاحب کو اپنے انجام کا قبل از وقت علم ہو گیا ہے۔ جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ نظامی صاحب نے پرانے اور سیانے مسلم لیگیوں ہی کو مقدم رکھا تو اس میں بھی کوئی برائی نہیں تھی۔ جس شخص نے مسلم لیگ کو پروان چڑھایا ہو وہ مسلم لیگ ہی سے محبت کر سکتا تھا۔ اور اس جماعت میں کام کرنے والے ہی اس کے مقرب ہو سکتے تھے۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ "نظامی صاحب ان لوگوں کی بھی سرپرستی کر جاتے تھے جن کے متعلق انہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی بدولت ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔" تو یہ شورش صاحب

کا ذاتی تاثر ہوگا۔ ہم نے تو آخر دم تک نظامی صاحب کے حلقۂ احباب میں ایسا ایک آدمی بھی نہیں دیکھا جو ملک کی دشمنی کا کبھی تصور تک بھی کر سکتا تھا یا جس کی بدولت ملک کو نقصان پہنچا ہو شورش صاحب لکھتے ہیں کہ نظامی صاحب سیاسی کام کرنے کے بڑے متمنی تھے لیکن ایک جماعت کیونکر فراہم ہو سکتی ہے خود اس کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں پہلے ہی یہ گزارش کی جا چکی ہے کہ نظامی صاحب نے سیاسی کام صرف اس وقت تک کیا جب تک قیام پاکستان کے لئے مسلم لیگ کے پرچم تلے کام کرنا ہر مسلمان کا فرض تھا۔ جونہی پاکستان قائم ہو گیا اور ملکی استحکام کے لئے تمام محب وطن سیاسی عناصر کو کام کرنے کی کھلی اجازت دینا ضروری ہو گیا نظامی صاحب کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ رہے اب وہ تمام سیاسی جماعتوں کے محبوب تھے۔ البتہ مسلم لیگ سے ان کی محبت کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور یہ ماضی کی دلچسپیوں کے باعث ایک قدرتی بات تھی۔

شورش صاحب نے کہا ہے کہ نظامی صاحب کو "اپنی رائے پر اتنا اعتماد ہوتا تھا کہ اس کے منوانے پر مصر ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دوستوں کے غور و فکر کا راستہ رک جاتا تھا" حقیقت یہ ہے کہ نظامی صاحب نے دوستوں کے غور و فکر کے راستے مسدود کرنے کی بجائے غور و فکر کے منبعے کھولے۔ انہیں اپنے دوست بڑے عزیز تھے اور ان کی خاطر وہ وزیروں تک کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لہذا وہ ان سے اپنی رائے منوانے پر کبھی مصر نہیں ہو سکتے تھے۔ بہر حال شورش صاحب۔ مرحوم کے ذاتی دوست

تھے۔ وہ گلہ کرنے میں آزاد ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جن کے بارے میں گلہ کیا گیا ہے وہ اب موجود نہیں ورنہ عین ممکن ہے وہ شورش صاحب کو بھی قائل کر لیتے اور انہیں اب یہ نہ کہنا پڑتا کہ "نظامی صاحب تنہا فیصلہ کرتے اور دوستوں سے توقع کرتے کہ بلا چون و چرا تسلیم کر لیں گے"۔۔۔ جو شخص عمر بھر فکر کی آزادی کے لئے جہاد کرتا رہا وہ دوستوں پر آمریت ٹھونسنے کا تصور کیونکر کر سکتا تھا۔ شورش صاحب نے لکھا ہے "۔۔۔ لیکن اس کا نتیجہ وہی نکلا جو ناگزیر تھا۔ یعنی وہ رحلت کر گئے تو ان کا مرکزی وجود بھی ختم ہو گیا"۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ نظامی مرحوم کا مرکزی وجود محض ہوٹلوں کی محفلیں نہیں تھیں۔ مرکزی وجود ان کا اخبار تھا چنانچہ ان کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ نوائے وقت کی صورت میں ان کا مرکزی وجود اب بھی قائم ہے۔ جن اخبارات نے قیام پاکستان سے پہلے یونینسٹوں کی گداگری کی اور قومی مفادات اور تقاضوں کا خیال نہ رکھا وہ ایک ایک کر کے بزم صحافت سے رخصت ہو چکے ہیں ان میں سے کچھ محض ڈیکلریشن قائم ہونے کی حد تک ممکن ہے باقی ہوں اگر کوئی پرانا اخبار زندہ ہے تو وہ نوائے وقت ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے کہ مختلف ادوار میں متعدد حوادث کے باوجود وہ شمع اب بھی فروزاں ہے اور آج بھی مرحوم کے پرانے ساتھی اپنے مرحوم راہنما کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اسے زندہ رکھنے کی کوششوں میں پوری تندہی سے مصروفِ عمل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ یقین پختہ سے

پختہ تر ہوتا چلا جائے گا کہ نظامی صاحب کی وفات سے صحافت میں جو خلا واقع ہوا تھا اسے کبھی پورا نہیں کیا جا سکے گا۔ اور انہوں نے اس میدان میں روشنی کا مینار بن کر جو راہیں دکھائی تھیں ان پر گامزن رہنا ہر دیانت دار صحافی کے لئے سرمایۂ افتخار بنا رہے گا۔

ظہور عالم شہید

دفتر نوائے وقت،
۲۳ فروری ۱۹۶۷ء

حمید نظامی

حمید نظامی کی موت اِتنی اچانک تھی کہ ہم میں سے کوئی شخص بھی اِس بُری خبر کو سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اوّل تو یہ ان کی موت کے دِن نہ تھے، عمر ہی کیا تھی ابھی تو اُنہوں نے زندگی کا سفر شروع کیا تھا، انہیں بال و پَر لگے تھے۔ اُفق کو اُنہوں نے جھانکا تھا کہ اس کی وسعتیں کہاں تک ہیں، دفعتہً سناؤنی آگئی۔ قدرت کی اَنمٹ تحریروں کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ اُن کی موت واقع ہوگئی۔ دوستوں نے خیال کیا شاید زندگی اور موت میں آنکھ مچولی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ رختِ سفر باندھ چکے ہیں۔ لیکن احباب جانکنی میں بھی زِندگی کے لَوٹ آنے کی خوش فہمی کا شکار تھے۔ انہیں یقین تھا کہ موت اس عمر میں اِن مضبوط اعصاب کو چھُو بھی نہیں سکتی ہے۔ کوئی صدمہ ان پر غالب آگیا ہے آناً فاناً اڑنچھو ہو جائے گا۔ نظامی صاحب پھر اسی طرح ہنسیں بولیں گے۔ گھڑی کی سُوئیوں اور

ان کے ضابطوں میں یکسانی تھی۔ قیاس یہ تھا کہ گھڑی میں اتفاقی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ یہ گھڑی ختم نہیں ہو سکتی چلے گی اور ضرور چلے گی۔ دوستوں کے جذبات نزع میں بھی ان سے مایوس نہیں تھے۔ انہیں قدرتِ کاملہ سے امید تھی کہ ان ہچکیوں سے وُہی قہقہے اُبھریں گے جو ان کے متین و خشک چہرے پر پھیل کر نقد و نظر کے خطوط اُبھار دیتے ہیں۔ وہ مرتے ہوئے بھی جی رہے تھے ان کے چہرے پر وہی سنجیدگی و شگفتگی اور تحمّل و اعتماد پایا جاتا ہے جو ان کے بارے میں خاص ہو چکا تھا۔ عالمِ ارواح کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے، مشکل کیا ناممکن! ایک ہی تو چیز ہے جو انسان کے بس میں نہیں کہ موت کیوں آتی ہے اور اس کے بعد انسان پر کیا گزرتی ہے، انسان مرتا بھی ہے یا نہیں؟ بہ قولِ اقبالؔ زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کا آغاز۔ لیکن یہ محض شاعری یا فلسفہ یا روحانی اقدار کے سفر کا کوئی مقام ہے جہاں انسان کو انشراحِ صدر ہوتا ہے۔ نظامی جن عادتوں اور خصلتوں کے انسان تھے پھر ان کی توانا صحت جس نہج پر استوار ہوئی تھی، موت کے بستر پر ان کا جو حال تھا جتنے دن وہ موت سے جنگ کرتے رہے اُن پر غشی طاری رہی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں خود بھی اپنی موت کا یقین نہیں تھا۔ وہ فرشتۂ اجل سے بھی تین روز تک اپنی آزادی کے سلب کئے جانے پر مدافعت کرتے رہے۔ بالآخر سپر انداز ہو گئے۔ انہوں نے امرِ ربّی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور دیکھتے دیکھتے آنکھوں واصل بحق ہو گئے۔ ان کی موت پر بہت کچھ لکھا گیا۔ کسی صحافی کا

جنازہ اس دھوم دھام سے نہیں اُٹھا۔ جن لوگوں نے زندگی بھر ان سے اختلاف کیا ان کی عظیم اکثریت بھی ان کی جواں موت پر اشکبار تھی۔ میّت کو غسل دینے سے میّت کو دفنانے تک یقین نہیں آتا تھا کہ حمید نظامی مر گئے ہیں۔ بھلا وہ شخص کیونکر مر سکتا تھا جس کے قلم سے بے شمار سیاستدان مر گئے تھے۔ جس نے ایک غریب الحال گھرانے میں پرورش پا کر محلوں میں بھونچال پیدا کر دیا تھا۔ جس کی زبان سے قصرِ اقتدار کے مینار کانپتے تھے جس کا قلم شمشیرِ اصفہاں تھا کہ اس کی کاٹ سے وزارتوں کے سر اُڑ جاتے تھے۔ جس کے اداریوں کو بڑے بڑوں کے دستر خوان پر ناشتہ سے زیادہ خصوصیت حاصل تھی جس کا اخبار حکومت کے مستبد کنگروں کو ہلا دیتا تھا۔ جس نے اُردو صحافت کو چار چاند لگا دیئے تھے جس کی تحریریں دیہاتی حسُن کی طرح سادہ و بے پروا تھیں جس کو ہَوا میں گرہ لگانے اور آسمان سے تارے توڑنے کا فن آتا تھا جس نے جھکنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ جو ایک دفعہ فیصلہ کرنے کے بعد پھر اُس پر خطِ تنسیخ نہیں کھینچتا تھا۔ جس نے قلم کی آبرُو کو ماں بہن کی عصمت کہا۔ جس کو خریدنا ناممکن تھا۔ جو اخبار نویسی کا ہیرو تھا جس نے بڑے بڑے فرعونوں کی سرکشی کو تہ و بالا کیا۔ جو زخم کھا کے فریاد کرنا عشق کی اہانت خیال کرتا تھا۔ جو دوستوں کے لئے نسیم سحری تھا، لیکن دشمنوں کے لئے گرزِ البرز شکن، جس نے اپنی زندگی کے شب و روز کو خاص قسم کے سانچوں میں ڈھال رکھا تھا۔ جو ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا لیکن اپنا دکھ درد کسی سے بیان نہیں کرتا تھا۔ جس کے پہلو میں دل تھا لیکن اپنوں کے

لئے۔ پرایوں کے لئے وہ صرف دماغ سے سوچتا تھا۔ ایک ایسے شخص کا ایکا ایکی اُٹھ جانا، موت کا جام پینا، کفن پہننا اور قبر کی گود میں ہمیشہ کے لئے سو جانا واقعی ایک سانحہ دلگداز تھا۔ جوشؔ نے کہا ہے ؎

کیا نزع کی تکلیفوں کا مزہ جب موت نہ آئے جوانی میں
کیا لُطف جنازہ اُٹھنے کا ہر گام پہ جب ماتم نہ ہُوا

حمید نظامی کا سفرِ آخرت اس کی ہُو بہُو تصویر تھا۔ جب میں نے احباب کے مجمع میں اعلان کیا جو اُس وقت باہر صحن میں بیٹھے تھے؛ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی آہی رہے تھے۔ کہ حمید نظامی کے چہرے پر رونق آگئی ہے۔ اُنہوں نے قدرے سنبھالا لیا ہے۔ اُس وقت مطلقاً احساس نہ تھا کہ ان کی یہ آخری رونق ہے۔ اور یہ سنبھالا اُن کا آخری سنبھالا ہے۔ دفعتہً یہ رونق مرجھاگئی، دھوپ میں اُڑ جانے والے رنگوں کی طرح اُڑگئی، اُن کا سنبھالا ع

شمع بجھتی ہے تو پھر اس سے دھواں اُٹھتا ہے

ثابت ہُوا۔ اُنہوں نے اپنی بیوی کا ہاتھ بھینچا۔ ڈاکٹر مبشّر حسن اُس وقت اُن کے پاس تھے۔ ان کا بازو تھاما، جیسے کہہ رہے ہوں۔

اچھا بھائی" ——— ع

کوثر پہ آملیں گے حریفانِ بادہ نوش

شورش کاشمیری دہلیز پہ کھڑا تھا، آغا جی کہا اور آخری ہچکیوں نے مسافر کو

رخصت کر دیا۔

حمید نظامی کیا تھے اور کیا نہیں یہ بعض دوسرے عقدوں کی طرح ابھی تک گم شدہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ پاکستان نے اپنی تاریخ کب لکھی ہے کہ حمید نظامی پر قلم اٹھائے۔ قائدِ اعظمؒ کے سوانح حیات ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں یار لوگوں نے الفاظ کے کھلونے بکھیر کر مطالب کا مینا بازار لگا دیا ہے۔ حمید نظامی کو اس ویرانہ آباد میں کون پوچھتا ہے؟ اِس سرزمین میں کیا کچھ گم نہیں ہو گیا؟ دماغوں پر بوجھ ڈالئے سوچتے جایئے۔ قائدِ اعظمؒ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ خان لیاقت علی خان سید اکبر کی گولی کا نشانہ ہو گئے۔ ملک غلام محمد کا محلاتی انقلاب آج تک صیغۂ راز میں ہے۔ اسکندر مرزا جلاوطنی میں پاکستان کا وظیفہ کھا رہا ہے اس کو پاکستان کی جیلوں میں ہوا کھانی چاہیئے تھی۔ جمہوریت کے ساتھ سیاسی تماش بینوں نے کیا سلوک کیا اس کے اعضاء پر ان قصابوں نے کیسے کیسے چھریاں چلائیں۔ آمریت نے کیونکر قدم رکھا۔ ماضی میں کیا نہیں ہوتا رہا۔ حال میں کیا نہیں ہو رہا ہے اور مستقبل میں کیا نہیں ہو گا ——— کوئی دانشور اس پر قلم نہیں اُٹھاتا۔ اس کی دانش لے دے کے غیر ملکی سیاست کے اُفق پر طوطے مینا اڑاتی ہے۔ کوئی قلم نہیں بولتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۔ ۔ ۔ دیمک چاٹ گئی ہے۔ کوئی شاعر نہیں چہچہاتا۔ معلوم ہوتا ہے ان کی زبانوں کو لُونی لگ گئی ہے۔ کوئی ادیب سامنے نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے انہیں ملک و قوم سے زیادہ تن و توش عزیز ہیں۔ کوئی مورخ نہیں اُٹھتا کہ اِس سرزمین میں تاریخ نے اپنا

سفر منقطع کر لیا ہے۔ ع

اللہ رے سنّاٹا آواز نہیں آتی

اِس خوفناک خلاء میں جب بھیانک صورتیں روشن ہو گئی ہیں۔ اور آبدار چہروں کو مسخ کیا جا رہا ہے حمید نظامی پر قلم اُٹھانا سہل نہیں۔ یہ بھی تاریخ ہی کی جاں کا دی ہے۔ معاصرت کا فتنہ موجود ہے۔ جو لوگ برسوں قلم گھساتے رہے اور عمریں اس وادی میں گزار گئے انہیں اپنے بزرگ ہونے کا "احساسِ کہتری" روکے ہوئے ہے اور جو اس کے ہم عمر تھے، اس کے ساتھ رہے، اکٹھا سفر شروع کیا ان کے قلم گنگ ہو چکے ہیں۔ بعض کی زبانوں پر مصلحتوں نے قفل ڈال دیئے ہیں۔ بعض کی طبیعتیں فکرِ معاش اور عشقِ بتاں میں آوارہ کیا آوارہ تر ہو گئی ہیں۔ محسوس سب کرتے ہیں کہ صحافت بیسوا کی جوانی ہو گئی ہے۔ قلم ٹوٹے ہوئے ساز ہیں۔ قرطاس کی آبرو لُٹ گئی ہے اور دوات میں دِل کا خون نہیں رہا۔ لیکن بازار میں پڑے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ سب سے اونچی بولی کہاں آکر ٹھیرتی ہے۔

حمید نظامی اور "نوائے وقت" لازم و ملزوم تھے۔ دونوں میں گل و بلبل کا رشتہ تھا۔ چاند اور چکور کا رشتہ، قافیہ و ردیف کا آہنگ، سُر اور تال کا لازمہ۔ حمید نظامی نوائے وقت کے لئے وہی کچھ تھے جو قائدِ اعظمؒ مسلم لیگ کے لئے۔ اور نوائے وقت اُن کے لئے وُہی تھا جو محمد علی جناح کے لئے مسلم لیگ۔ حمید نظامی اور نوائے وقت

آپس میں عشق و حسن کا لازمہ تھے۔ ایک ہیر، دوسرا رانجھا، ایک لیلیٰ دوسرا مجنوں، ایک شیریں دوسرا فرہاد، ایک عذرا دوسرا وامق، ایک سسّی دوسرا پنّوں، ایک جسم دوسرا روح، ایک زبان دوسرا بول، ایک لفظ دوسرا معنی، ایک آواز دوسرا للکار، ایک نغمہ دوسرا آہنگ، ایک حمید نظامی دوسرا نوائے وقت۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے سوچنا ایسا ہی تھا جیسے یہ کہا جائے کہ پاکستان قائدِ اعظمؒ کے بغیر ہی کسی بزرجمہر کی سیاست سے معرضِ وجود میں آگیا ہے۔ نوائے وقت نظامی کی بساطِ سیاست کا ایک ایسا مہرہ تھا جس نے فرزیں کو ہمیشہ شکست دی۔ جس نے ترُپ کی ہر بازی جیتی۔ جس نے شطرنج کو اپنے ڈھب پر رکھا اور مقابل کے کھلاڑیوں کو شہ مات دیتا رہا۔ جس نے عمر بھر قلم کی چوگان کھیلی اور آخر کار صحافت کا یہ قطب الدین ایبک چوگان کھیلتے کھیلتے آغوشِ لحد کی نذر ہو گیا۔ ع

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

یہ بتانا سیرت نگار کا کام ہے کہ وہ کون تھے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ ان کے والد کیا تھے؟ کب پیدا ہوئے، کب رحلت فرمائی، کتنے بہن بھائی تھے، کتنے حیات ہیں، کتنوں کو موت چاٹ گئی، کس شہر یا قصبہ سے نکلے، کہاں کہاں گئے لاہور کب آئے، کہاں تک تعلیم حاصل کی، کیسے پڑھے، پڑھنے کے بعد کیا کرتے رہے، نوائے وقت کب نکالا، کیسے نکالا، کیونکر نکالا، اُس وقت کون کون شریک تھا، ہفتہ وار تھا یا روزانہ، روزنامہ بنا تو کب بنا، اس کے لئے

کہاں کہاں کھکھیڑیں اٹھائیں اور ہاں ان کی شادی کب ہوئی کہاں ہوئی کتنی اولاد ہے کیا کرتی ہے غرض اس سلسلے کی جتنی کڑیاں ہیں وہ ایک محقق یا مورخ کا کام ہے، کہ ان کی جستجو کرے، ان کی کھوج لگائے میرا کام اس حمید نظامی کے خط و خال بیان کرنا ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد ہمارے ساتھ رہا جس کا اس روز سے قبر تک ہمارے ساتھ تعلق خاطر رہا۔ ہم جس کے اور جو ہمارا ہو گیا تھا۔ جو ناغہ کئے بغیر ہمیں ملتا، ہر روز ملتا تھا اور دن میں دو دفعہ ملتا تھا۔ ہم جس کے مختصر حلقہ احباب کے "نورتن" تھے۔ اور جو شہنشاہ نہ ہونے کے باوجود شہنشاہ ہی تھا۔

تھی جس کی فقیری میں بوئے اسداللہی

جس حمید نظامی کو میں نے دیکھا، میں نے پڑھا، میں نے پرکھا، میں نے تولا، میں نے جانچا اور میں نے محسوس کیا۔ یہ کہانی اس حمید نظامی کی ہے۔ یہ اسی کا خاکہ ہے جس میں

زبان میری ہے بات اُن کی

اس کی اس کہانی میں الفاظ میرے ہیں معانی اس کے۔ تحریر میری ہے تصویر اس کی، صورت میں نے بنائی ہے سیرت اس کی ہے۔ قلم میرا ہے، سوانح اُس کے۔ جو ایک کھلی کتاب تھا جس میں کوئی خم نہیں تھا۔ کوئی شتر گربہ نہیں تھا۔ جو ہر ایطاء جلی اور ایطاء خفی سے پاک تھا جس میں شاعرانہ نسبتوں کی رو سے کوئی عیب تنافر نہ تھا۔ جو ایک مربوط نظم تھا لیکن نہیں، نظم مربوط ہو یا غیر مربوط، معرّیٰ ہو یا آزاد بہرحال نظم ہوتی ہے۔ اس میں الفاظ بولتے، مطالب گنگناتے، افکار چہچہاتے

اور اشعار مسکراتے ہیں۔ اس میں بہرحال ردیف و قافیہ کا مصرعوں کے اعتبار ہی سے ایک دلفریب آہنگ ہوتا ہے ——— وہ فلسفہ کی کتاب کی طرح خشک تھا اور تاریخ کے بہاؤ کی طرح رواں۔ اس سے بھی بہتر تشبیہہ ریاضی سے دی جا سکتی ہے کہ وہ ہندسوں کی طرح ضرب و تقسیم اور جمع و تفریق کا طے شدہ حاصل تھا۔ اسے قانون کے مخصوص الفاظ کی طرح اِدھر اُدھر ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔

میں ان کا پرانا واقف تھا۔ میں بھی لاہور میں نامور ہوا، وہ بھی لاہور میں پروان چڑھے۔ وہ اپنے آبائی قصبہ سانگلہ ہل سے لاہور آئے تھے۔ جن دلوں لاہور آئے ایک ناٹے قد کے منحنی سے بے رُو نوجوان تھے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اور زندگی بنانے میں لگ گئے۔ ان کے سامنے اُس وقت ایک ہی نصب العین تھا اور وہ تھا حصولِ تعلیم۔ ان کے ہم جماعت رفقا میں بہت سے نوجوان مثلاً جسٹس انوار الحق، کرنل امجد حسین سیّد، خان عبدالستار خان نیازی، میرزا عزیز بیگ، مسٹر اسلم صدیقی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مسٹر ظہور عالم شہید، مولوی اکرام الحق، ابو یوسف قاسمی اور بعض دوسرے احباب شامل تھے۔ لیکن ع

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم،

اِس وادی میں صرف چار ہم جماعت نوجوانوں نے قدم رکھا۔ عزیز بیگ نے انگریزی جرنلزم اختیار کیا لیکن بہت جلد اس خارستان سے نکل گئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام

خورشید دراثتہً صحافی تھے۔ ان کے والد مولانا عبدالمجید سالک نے انہیں اسی فن میں پروان چڑھایا، مگر اخبار نویسی سے نکل کر اخبار آموزی میں لگ گئے یعنی یونیورسٹی میں شعبۂ صحافت کے اُستاد ہو گئے۔

ظہور عالم شہید شروع دن سے نوائے وقت کے ساتھ منسلک ہیں اور اس وقت ملک کے بہت بڑے نیوز ایڈیٹر اور جرنلسٹ سمجھے جاتے ہیں۔ قدرت نے ان کے قلم میں بھی مرحوم نظامی کی خوبو رکھ دی ہے۔ نظامی صاحب نے جوں توں کر کے تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے زندگی کو ہر طرح برتا۔ دن رات محنت کی۔ ان کے والد کا سایہ عنفوان طفلی ہی میں اُٹھ گیا تھا۔ وہ صبح و شام محنت کرتے۔ ٹیوشن پڑھاتے اور اس سے جو کماتے اس سے تعلیم کے اخراجات پورے کرتے۔ عرب ہوٹل ان دنوں ان کی آماجگاہ تھا۔ اسلامیہ کالج کے بہت سے خوب رو اور ذہین بے رُو اور فطین طلبہ اسی ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔ جو کالج کے دروازہ پر چٹپٹے کبابوں کے لئے مشہور تھا۔ ان طلبہ کے علاوہ لاہور کے بعض جواں سال اور کہنہ مشق جرنلسٹ مثلاً مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا مرتضیٰ احمد میکش، مسٹر آئی اے درّانی، حاجی لق لق مسٹر دلبر حسن مسحور اور "پرتاپ" کے مسٹر نیپالی بھی عرب ہوٹل ہی میں نشست جماتے تھے۔ شاعروں کی ایک بڑی کھیپ بھی یہیں جمع ہوتی مثلاً اختر شیرانی وغیرہ، افسانہ نگار بھی یہیں چلے آتے مثلاً کرشن چندر، عاشق حسین بٹالوی، جو اُن دنوں افسانے لکھا کرتے تھے اور ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "سوزِ ناتمام" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

عرب ہوٹل دراصل اہلِ قلم کی خالی جیبوں کے بھرم بھاؤ کا محافظ تھا. جتنا نقد چلتا اتنا ادھار، لیکن ادھار کھانے والے چٹ کر جانے والے نہیں تھے ——— نظامی مرحوم بھی عموماً یہیں بیٹھتے اور روکھی پھیکی کھا کر گزر بسر کرتے تھے۔ اس زمانہ میں وہ کچھ زیادہ خوش پوش بھی نہ تھے. معمولی لباس اور معمولی خوراک ۔ قدرت نے ان کے چہرے سے دلکشی سلب کی ہوئی تھی. فی الجملہ ان میں حسن و رعنائی کا شائبہ تک نہ تھا. معلوم ہوتا تھا کالج کے خندہ رُو نوجوانوں کی ڈار میں "اغلاط نامہ" ہیں. اس کے باوجود کہ وہ خوب روؤں میں نہیں تھے لیکن حسین نہ ہونے کی تلافی ذہین ہونے سے ہوگئی تھی۔ وہ بلا کے ذہین طالب علم تھے . اپنے سبق کے علاوہ عام معلومات پر بھی ایسا عبور تھا ۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ڈاکٹر ستیہ پال کے اخبار "نیشنل کانگرس" میں ملازمت کی. چراغ حسن حسرت روایتی طور پر ان کے اُستاد ہوگئے ۔ دنوں تک وہاں خبروں کا ترجمہ کرتے رہے. آخر اس سے الگ ہوگئے ۔ یہ زمانہ کانگرسی رہنماؤں سے ان کے تنفّر کے آغاز کا تھا. ان پر کانگرس کے نیتاؤں کی صورتیں آشکار ہوگئیں کہ ؏

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا ،

اُنہوں نے بمصداق بھاری پتھر تھا اُٹھ نہ سکا، چوم کے چھوڑ دیا۔ زندگی کے دُکھ کیا ہوتے ہیں اُن پر صبا رفتاری کے ساتھ عیاں ہوتے گئے. اُنہوں نے زندگی کو اس کے تمام دُکھوں اور اس کی تمام اذیتوں کے ساتھ گزارا، قلم کی محنت شروع

کی۔ اسی زمانہ میں اردو نثر نگاروں کا ایک تذکرہ "داستانِ ادب" کے نام سے لکھا۔
جو مالی ضرورتوں کی خانہ پری کے لئے ایک نامور پبلشر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یہ تذکرہ
آج تک اسی پبلشر کے نام پر طبع ہو رہا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے پبلشر سے
کہا تھا کہ اب تو اس کتاب کو ختم کر دینا چاہیئے کیونکہ اردو زبان کے اہلِ قلم میں اضافہ
ہو چکا ہے اور جو کچھ اس میں درج ہے اس کے متعلق مزید تحقیقات سامنے آگئی ہیں۔
لیکن پبلشر جو ان دنوں نیاز مند بن چکا تھا، مسکرا کر طرح دے گیا۔ کہنے لگا فی الحال تذکرہ
چل رہا ہے اور لوگوں میں اس کی مانگ موجود ہے۔ کچھ زیادہ ایڈیشن بھی نہیں چھپے ابھی
پندرہ سولہ ایڈیشن ہی نکلے ہیں۔

غرض بی۔ اے تک نظامی صاحب نے اسلامیہ کالج میں لسٹم پسٹم بسر
کی۔ ایم اے انگلش میں داخلہ کا مرحلہ آیا تو ایف سی کالج میں چلے گئے۔ اور وہاں
سے ایم اے کیا۔ اس کے بعد ان کے سامنے بے شمار راہیں کھلی تھیں مثلاً قلم
ان کے پاس تھا اور وہ بے عیب اردو لکھنے، صاف ستھرا ترجمہ کرنے اور انگریزی
مضامین کا مافی الضمیر اردو میں ڈھالنے پر قادر ہو چکے تھے۔ بعض دوستوں نے انہیں
اُستاد بن جانے کا مشورہ دیا۔ وہ اسکول میں بھی مدرس ہو کر جا سکتے تھے۔ اور کالج میں
بھی ایک دوسرا ایم اے کرنے کے بعد پڑھا سکتے تھے۔ ان کے سامنے ملازمت
کے دروازے کھلے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کچھ دنوں چودھری محمد حسین سپرنٹنڈنٹ
پریس برانچ کی ماتحتی میں ترجمہ کا کام بھی کیا۔ لیکن سرکاری ملازمت سے چونکہ مناسبت

نہ تھی اِس لئے فقر و فاقہ کے دِنوں سے آسودگی کے فوراً بعد پریس برانچ سے مستعفی ہو گئے۔ یہ غالباً بی اے کرنے کے بعد ملازمت کا ایک دَور تھا۔

بعض ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی۔ اِس لحاظ سے گویا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانیوں میں سے تھے۔ یہی دن تھے جب انہوں نے قائدِاعظمؒ سے رابطہ پیدا کیا۔ اور طلبہ میں بہت جلد اپنی دیانت وصیانت کے باعث معتمد ہو گئے۔ قائدِاعظمؒ نے ابھی تک پاکستان کے نظریہ کو لیگ کا باقاعدہ سیاسی موقف نہیں بنایا تھا۔ ابھی وہ اس پر سوچ ہی رہے تھے لیکن حمید نظامی سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے مختلف شہروں میں پاکستان پر تقریریں کر رہے تھے۔ گو اُس وقت ان کی آواز کا وہ مقام نہیں تھا لیکن بعد میں یہی آواز قوم کی آواز ہو گئی۔ اور جب قائدِاعظمؒ نے اس پر مہرِ توثیق ثبت کی تو قرار دادِ لاہور کا نام ہی پاکستان ہو گیا۔

نظامی صاحب ایک سلجھے ہوئے مقرر تھے۔ ان میں ایک پارلیمانی مقرر اور سیاستدان خطیب کی خصوصیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ لیکن جب انہوں نے نوائے وقت کو ہفتہ وار جاری کیا۔ تو خطابت سے دستبردار ہو گئے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ خطابت اور صحافت ایک ساتھ نہیں چل سکتے — آدمی کو ایڈیٹر ہونا چاہیئے یا مقرر۔ دونوں میں شاذ ہی کوئی شخص پرواز کر سکتا ہے۔

گیارہ ستمبر ۱۹۳۹ء کو مَیں ملتان میں گرفتار ہو کر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کے تحت سات سال کے لئے قید ہو گیا۔ ہمارے پیچھے کیا ہوا ایک قیدی کی حیثیت سے کچھ معلوم نہ تھا۔ سات برس اس زمانہ میں سات صدیاں تھیں۔ ملکی سیاست سے قطع نظر عالمی سیاست کا پانسہ پلٹ رہا تھا۔ کئی سفینے ڈوب رہے اور کئی اُبھر رہے تھے۔ احرار تو فوجی بھرتی کے خلاف نعرہ زنی کی پاداش میں فنا ہو گئے۔ کانگرس نے پہلے وزارتوں سے استعفیٰ دیا پھر انفرادی ستیہ گرہ کیا۔ پھر ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلائی۔ مسلم لیگ نے لاہور میں سالانہ اجلاس کر کے پاکستان کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ ہندو اخباروں نے پاکستان کے خلاف اتنا ہنگامہ برپا کیا کہ قائدِ اعظمؒ نے ایک دفعہ خود فرمایا کہ پاکستان کی تحریک عام کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ ہندو اخباروں کے منفی رّویہ کا ہے۔ ——— میں رہا ہوا تو کائنات ہی پلٹا کھا چکی تھی ع

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

کانگرس کے راہنما مسلم لیگ کے ہاتھوں دو قومی نظریہ سے پٹ چکے تھے۔ دو قومی نظریہ ملک میں راسخ ہو چکا اور مسلمانوں کی پچانوے فیصد اکثریت اس پر متفق تھی۔ ہٹلر بازی ہار گیا، مسولینی کو پھانسی لگ گئی۔ گویا زمین و آسمان نے کاملاً ہئیت تبدیل کر لی۔ مَیں ایک روز پولیس کے تھانے سے ہفتہ وار حاضری دے کر لوٹا تو کافی ہاؤس میں رک گیا۔ وہاں بہت سے کمسن چہرے جوان ہو چکے تھے اور کافی کے مشروب میں مستغرق

سگرٹوں کا دھواں چھوڑ کر مرغولے بنا رہے تھے۔ ایک گوشہ میں حمید نظامی چند خوش چہرہ نوجوانوں کے ساتھ فروکش تھے۔ میں نے پرانی جان پہچان یا علیک سلیک کی بنا پر مصافحہ کیا لیکن ان میں گرمجوشی نہ تھی اور اس کا سبب بھی ظاہر تھا کہ ہم دونو مخالف سمتوں کے مسافر تھے۔ وہ قائدِ اعظمؒ کے پیرو کار تھے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کا مقلد تھا اِس لئے مجھے ان کی سرد مہری پر تو افسوس نہ ہوا لیکن اپنے ہاتھ بڑھانے پر ملال ضرور ہوا

غرض نوائے وقت" انہی دنوں ہفتہ وار سے روزنامہ ہو گیا اور دیکھتی آنکھوں تمام مسلمان اخباروں میں بازی لے گیا۔ جب مسلم لیگ کی تحریک نے زور پکڑا تو نوائے وقت کا بول بالا ہوا۔ روزنامہ شہباز سید امجد علی (سابق وزیر مالیات) کی وساطت سے یونی نسٹ پارٹی کی ملکیت ہو گیا تھا۔ مولانا مرتضیٰ احمد میکش دل و جان سے پاکستانی تھے۔ انہوں نے خضر وزارت سے قائدِ اعظمؒ کی لڑائی ہوتے ہی "شہباز" کو فی الفور چھوڑ دیا۔ نظامی صاحب نے اس پر افتتاحیہ لکھا اور ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے نوائے وقت کے ادارۂ تحریر میں شمولیت کی پیشکش کی مگر مولانا میکش گوشہ نشین ہو گئے۔
یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ تحریک کے اس زمانۂ شباب میں تو نوائے وقت کے ادارۂ تحریر میں ماہنامہ تحریک دہلی کے ایڈیٹر مسٹر گوپال متل بھی شامل تھے۔ جو عقیدتہً دہریہ اور سیاستہً ایم این رائے کے ساتھی تھے۔ وہ ایک خوشگو شاعر ایک اچھے نثر نگار اور ایک قابلِ قدر صحافی تھے اُن دنوں وہ نوائے وقت میں

بین الاقوامی سیاست پر کالم لکھا کرتے۔ انہیں بھی رائیسٹ ہونے کی وجہ سے کانگرس کے پروگرام سے سخت اختلاف تھا۔ نوائے وقت ان دنوں بیڈن روڈ سے نکلتا تھا۔ جب فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی اور خونِ انسانی پانی ہوگیا تو نوائے وقت کا دفتر شاہ دین بلڈنگ مال روڈ پر آگیا۔ اب نوائے وقت محض ایک اخبار ہی نہیں رہا ادارہ بن گیا تھا۔ نکلنے کو تو "زمیندار" بھی نکلتا تھا۔ اور خوب نکلتا تھا۔ لیکن ع

وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

نوائے وقت بالا بلند ہوتا گیا۔ اور دنوں ہی میں اردو روزناموں کا سرخیل ہوگیا۔ "ڈان" کی طرح اس کو ایک تحریک کی خصوصیت حاصل ہوگئی۔ ایک ادارہ ایک تنظیم اور ایک انجمن کے درجہ پر فائز ہوگیا۔ اس نے مسلم لیگ کے حق میں پراپاگنڈے کے تمام اسرار و رموز سے فائدہ اُٹھایا۔ اس کو احساس تھا کہ اس وقت وہ جنگ کے میدان میں ہے اور جنگ میں سبھی قسم کے حربے جائز ہوتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی طاقت ایک تو اس کے ایڈیٹر حمید نظامی کا فہم اور قلم تھا۔ دوسرے اس کی پشت پناہی مسلم لیگ کے زعما اور وہ تمام مسلمان افسر کر رہے تھے۔ جو اس وقت حکومت کے ایوان میں موجود تھے۔ اور پاکستان کی تحریک کو شد و مد سے آب و غذا مہیا کر رہے تھے۔ نوائے وقت خبروں ہی کا مخزن نہیں تھا بلکہ وہ رازہائے درونِ پردہ کو بھی بے نقاب کر رہا تھا۔ اس کی سپلائی لائن : (SUPPLY LINE) بہت مضبوط تھی۔ مرکزی حکومت کے ذمّہ دار

مسلمان افسر اور صوبائی حکومت کے اربابِ بست وکشاد جو تحریکِ پاکستان کے دِل و جان سے حامی تھے، نوائے وقت کو سرکاری راز پہنچانا قومی خدمت کا حصّہ سمجھتے تھے۔ نتیجتہً نوائے وقت تحریکِ پاکستان کی آواز ہو گیا۔ حمید نظامی کے عروج و اقبال کا یہی زمانہ تھا۔ جب وہ شہرت اور عزت کے بامِ رفعت پر پہنچ گئے تو کئی افسر اُن کے ذاتی دوست بن گئے۔ خود قائدِ اعظمؒ نے انہیں ورکنگ کمیٹی میں لینے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن حمید نظامی نے انکار کیا اور قائدِ اعظم سے کہا :

قائدِ اعظمؒ! آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر، میں آپ کا ادنیٰ پیرو کار ہوں لیکن ورکنگ کمیٹی میں شمول سے مجھے معاف رکھیں میں فی الحال اس ذمّہ داری کو قبول کرنے سے معذور ہوں یہ ایک بڑی نازک ذمہ داری ہے جس کو ہر کہ و مہ نہیں اُٹھا سکتا۔ آپ کی مجلس عاملہ میں شامل ہونا سب سے بڑا قومی اعزاز ہے۔ لیکن ابھی میں اس مقام تک نہیں پہنچا۔ مجھے مجلس عاملہ کی رکنیت کی بجائے آپ کی شفقت درکار ہے۔ اور بحمد للہ وہ مجھے حاصل ہے۔

نظامی صاحب نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ قائدِ اعظمؒ اِس انکار سے ناراض نہیں ہوئے۔ بلکہ مسرور ہوتے انہوں نے ایک صوبائی لیڈر کے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا ــــ " دیکھا بعض لوگ مجلسِ عاملہ کی رکنیت کے لئے بھاگے پھرتے ہیں۔

اور قائدِ اعظم کو سفارش کرتے ہیں۔ کیا انہیں پتہ نہیں کہ قائدِ اعظمؒ سفارش اور رشوت کے سخت دشمن ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کو ان انسانوں کی ضرورت نہیں جو خود کسی عہدے کی خواہش کریں۔ قائدِ اعظم ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو حمید نظامی کی طرح قابلیت اور انکسار رکھتے ہوں۔"

نظامی صاحب نے اِس ضمن میں قائدِ اعظمؒ کا ایک خط بھی دکھایا جو اُنہوں نے بمبئی سے لکھا تھا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ انہیں حمید نظامی پر کِس قدر اعتماد تھا اور وہ انہیں کتنا عزیز رکھتے تھے۔ یہ خط غالباً ہفتہ وار چٹان میں چھپ چکا ہے یا پھر نظامی صاحب کے ذخیرہ خطوط میں محفوظ ہوگا۔ کیونکہ بعض اہم خطوط وہ بڑی حفاظت سے رکھتے تھے۔ تحریروں کو محفوظ رکھنا ان کی عادت میں داخل تھا ——— اور اس لحاظ سے وہ ایک ہوشیار سیاست دان تھے۔

پاکستان بنا تو "نوائے وقت" ملک کے اخباروں میں کئی پہلوؤں سے سرخیل ہوگیا۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات تک نوائے وقت نے اپنا رویہ حکومت کے حق میں رکھا لیکن وزرا کی حمایت یا اس قسم کی سرکاری پبلسٹی جو آجکل اخبارات کا طرۂ امتیاز ہو چکی ہے اس سے اجتناب کیا۔ یہ وقت حکومت کی مشینری کو فٹ کرنے اور بعض خاص افراد کو خاص جگہوں پر لگانے کا تھا۔ لیکن نوائے وقت نے اِن دنوں بھی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ انگریز افسروں پر فراخدلی سے بھروسہ نہ کرے۔ بعض مسائل ایسے ہیں جن کے افشا ہونے پر مختلف قسم کی اڑچنوں کے پیدا ہونے کا اِمکان

ہے۔ نظامی صاحب کی بصیرت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اشارتاً جنرل گریسی کو کمانڈر انچیف کے عہدے سے سبکدوش کئے جانے پر اصرار کیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جہادِ کشمیر میں جنرل گریسی مفید نہیں ہو سکتے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ گریسی نے پاکستان کے کشمیر پر حملہ کو روکنا چاہا، ماؤنٹ بیٹن کو اطلاع کی اور اس طرح کئی رازوں کو برطانوی دفتر خارجہ میں منتقل کیا۔

قائدِ اعظمؒ کی رحلت کے بعد نوائے وقت نے ممدوٹ وزارت کی سبکدوشی پر خان لیاقت علی خان کے بعض سیاسی عزائم سے اختلاف کیا۔ اسی اختلاف کی شدت کا نتیجہ سر فرانسس موڈی گورنر پنجاب کی سبکدوشی کا مطالبہ تھا۔ پہلے تو یہ مطالبہ دھیرے دھیرے اُبھرا پھر زور پکڑ گیا۔ نظامی مرحوم کی عادت تھی کہ جس شخص یا جماعت کو وہ ہدفِ تنقید بناتے اس کے خلاف مہم کا آغاز ایڈیٹر کے خطوط سے کرتے پھر خبریں نکلتیں۔ اس کے بعد "سرِ راہے" میں مذاق اڑاتے۔ آخر میں اداریوں میں پھبتی دیتے نتیجتہً ایک تحریک پیدا ہو جاتی۔ چاروں طرف ایک سی آوازیں اُٹھنے لگتیں، دیکھتی آنکھوں ایک مسئلہ، مطالبہ ہو کر لوگوں کے دل و دماغ میں اُتر جاتا۔ حکومت دیکھتی سوچتی رہ جاتی۔ بالآخر سپر انداز ہو کر اس مطالبہ کی سچائی کو تسلیم کر لیتی۔ ان معرکوں میں عام اخباران سے الگ تھلگ رہتے بلکہ محکمہ تعلقات عامہ کی شہ پر حکومت کی تائید و حمایت کرتے، نوائے وقت پر کیچڑ اچھالتے مگر وہ ان اخباروں کو شاذ ہی منہ لگاتے تھے ذاتیات میں بالکل نہ الجھتے۔ اپنی دھن میں لگے رہتے۔ اور اس قسم کا پراپگنڈا کرتے

کہ دشمن زیر ہو جاتے۔ مسٹر فرانسس موڈی کو بالآخر سبکدوش ہونا پڑا۔ ان کی سبکدوشی دراصل خان لیاقت علی خان کی پنجاب میں پہلی سیاسی شکست تھی۔ اس کا ایک خاص نتیجہ یہ نکلا کہ خان لیاقت علی خان اور حمید نظامی میں ٹھن گئی۔ نوائے وقت ان کا نکتہ چین ہو گیا۔ اس نکتہ چینی نے سنگینی کی شکل اختیار کر لی اور سنگینی اتنی بڑھی کہ نوائے وقت کی رگِ جاں کے لئے چھری ہو گئی۔

نظامی نے اخباروں پر سیفٹی ایکٹ کے استعمال اور ایڈوائزری کمیٹی کے تقرر کے سوال کو ایک نیا موضوع یا مسئلہ بنا لیا۔ اب جو اس کے خلاف انہوں نے قلم اٹھایا تو اس کی گونج دور دور تک چلی گئی۔ خواجہ شہاب الدین اس زمانہ میں وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اطلاعات تھے۔ ان کے کاٹے کا بھی علاج نہیں۔ جس کو ایک دفعہ ڈس لیں اس کا بچنا محال ہوتا ہے۔ حمید نظامی کا ان سے اس سوال پر بگاڑ ہو گیا۔ وہ مسٹر فرانسس موڈی کی مہم میں اندر خانہ ان کو یقین دلا رہے تھے کہ مطالبہ صحیح ہے اور بروایت خود بھی گورنری کے امیدوار تھے۔ لیکن لیاقت علی خاں کے روبرو انہوں نے دوسری پوزیشن اختیار کی ــــ نظامی صاحب ہمراہیوں اور ساتھیوں کے دوغلہ پن سے سخت خفا ہو جاتے۔ چونکہ وہ خود پختہ وعدہ کے انسان تھے لہذا اپنے دوستوں کو بھی وعدہ کا پختہ دیکھنا چاہتے تھے۔ خواجہ صاحب نے پی این ای سی کے ارکان کو اپنے سانچہ میں ڈھالنا شروع کیا۔ اس وقت تک پی این ای سی کے صدر الطاف حسین اور سیکرٹری جنرل حمید نظامی تھے۔ نظامی صاحب اخباروں پر سیفٹی ایکٹ کے استعمال کو

اصولاً غلط گردانتے رہے۔ اگرچہ اُس وقت تک کسی اخبار پر اس کا استعمال نہیں ہوا تھا، لیکن انہیں یقین تھا کہ اس کا استعمال مخصوص مقاصد کے تحت ضرور ہوگا۔ اور حکومت جب اس قسم کے قانون بناتی ہے تو اس کے سامنے خاص افراد کی من مانی کے مخفی مقاصد ہوتے ہیں۔ خواجہ شہاب الدین نے نظامی صاحب کی اس مہم کو ملفوف کرنے کے لئے ایڈوائزری کمیٹی کا شوشہ چھوڑا کہ جب تک اخباروں کے نمائندوں پر مشتمل کمیٹی کسی اخبار کے مسئلہ کو ہاتھ میں نہیں لے گی اور وہ سفارش نہ کرے گی کسی اخبار سے باز پرس نہ ہوگی۔ نظامی صاحب خواجہ صاحب کے اس وعدہ کی حقیقت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ کمیٹی جن نمائندوں پر مشتمل ہوگی ان کی اکثریت کیسی ہوگی۔ نظامی صاحب نے اس پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھا کہ اخبارات کو سیفٹی ایکٹ کا شکار بنانے کے لیے حکومت کیا پخت و پز کر رہی ہے ——— ؟ اخبارات کا جرم ڈھکا چھپا نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں چھپ کر پبلک میں آجاتا ہے۔ اگر کوئی اخبار تعزیرات پاکستان کے تحت کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانا چاہیئے تاکہ قانون شہادت مجروح نہ ہو اور ملزم کو شکایت نہ رہے کہ اسے بے گناہ سزا دی گئی ہے۔ اس ساری کشمکش سے عہدہ برا ہونے کے لیے پی این ای سی کا اجلاس کراچی میں بلایا گیا۔

نظامی صاحب سے اُس وقت تک میرے تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں روزنامہ آزاد کا ایڈیٹر تھا۔ ایک دفعہ صوبائی کمیٹی میں اس کے طلب کرنے پر گیا تو وہاں

بحیثیت رکن وہ بھی موجود تھے۔ فیض احمد فیض کمیٹی کے صدر تھے۔ معلوم ہؤا کہ "آزاد" میں کرشن چندر کا افسانہ "پشاور ایکسپریس" چھپا ہے جس سے پاکستان کی اہانت ہوتی ہے، میں اپنا ایک مختصر سا بیان دے کر واپس آ گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اشاعت سے پہلے اس افسانہ کا علم ہی نہ تھا۔ ایڈیٹر میں ضرور تھا لیکن عملہ کے ایک دوسرے دوست نے جائزہ لئے بغیر چھاپ دیا۔ بہرحال اس افسانہ کی پاداش میں "آزاد" سے پانچ سو کی ضمانت طلب کر لی گئی۔ مولانا اختر علی خاں نے فون پر بتایا کہ تمہارے چلے جانے کے بعد حمید نظامی نے اخبار کو قطعی بند کر دینے کا مشورہ دیا لیکن معاملہ ضمانت پر ختم ہو گیا۔ نظامی صاحب کو بھی کسی طرح مولانا اختر علی خاں کی اطلاع کا علم ہو گیا۔ انہوں نے برسوں کے بعد بلکہ نوائے وقت کی زندگی میں پہلی دفعہ مجھے فون کیا کہ آپ سے اختر علی خاں نے کیا بات کہی ہے۔ میں نے جو سنا تھا کہہ دیا انہوں نے واشگاف تردید کی۔ کہنے لگے اگر آپ دفتر زمیندار میں چلنے کو تیار ہوں تو میں وہاں پہنچ کر روبرو تردید کرنے اور مولانا اختر علی خاں کی غلط بیانی پر احتجاج کو تیار رہوں۔ کمیٹی کی کارروائی راز میں ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ آپ فیض احمد فیض سے پوچھ سکتے ہیں کہ "آزاد" کے معاملہ میں کس نے کیا کہا۔ میں نے فیض کو فون کیا اور ان سے پوچھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ انہوں نے مولانا اختر علی خاں کی حکایت پر قہقہہ لگایا اور فرمایا کہ آپ کے مسئلہ میں حمید نظامی شروع سے آخر تک خاموش رہے۔ چونکہ افسانہ ان حالات میں واقعی بیہودہ تھا۔ لہذا چودھری صاحب سے کہا گیا کہ وہ کوئی سخت اقدام نہ کریں فی الحال اخبار کو

انتباہ کردیں یا معمولی رقم کی ضمانت لے لیں۔ اِس کے علاوہ آپ سے جو کچھ کہا گیا وہ محض افسانہ ہے۔ مولانا اختر علی خاں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے وہ غلط ہے۔ آپ میری طرف سے انہیں کہہ سکتے ہیں:

دروغ گو را حافظہ نہ باشد

ایک روز "قندیل" کا پروف ریڈر ظہور الحسن ڈار، جو بدقسمتی سے میرا نیاز مند سمجھا جاتا تھا۔ میرے ہاں آیا اور کہنے لگا کہ نظامی صاحب سیفٹی ایکٹ کے معاملہ میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ آپ پی این ای سی کے ممبر بن جائیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ وہ مجھ سے وعدہ لے کر واپس چلا گیا اور پی این ای سی کی رکنیت کے فارم لے آیا۔ میں نے خانہ پُری کر کے دستخط کر دیئے۔ اور سالانہ چندہ کا چیک حوالہ کیا۔ اگلے روز دس بجے صبح میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اچانک نظامی صاحب آ گئے۔

نظامی صاحب؟

میرے لئے ان کی تشریف آوری اچنبھے کا باعث تھی، میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ "چٹان" کی تعریف کی۔ پھر سیفٹی ایکٹ کے اندرونی رازوں کا پردہ چاک کیا اور بتایا کہ اربابِ اختیار کیا سوچ رہے ہیں۔ آخر میں مجھ سے شام کو لورینگ میں اکٹھے چائے پینے کا وعدہ لے کر چلے گئے ـــ القصہ اسی روز ۵ بجے شام میں لورینگ ریستوران پہنچا تو نظامی

صاحب برآمدے ہی میں حسبِ معمول براجمان تھے ۔ میز کے گرد کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر ہر روز شام کو ان کے جگری دوست فروکش ہوتے، چائے پیتے گپ چلتی اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی نشست کے بعد یہ اجلاس ختم ہو جاتا۔ جس وقت میں پہنچا اس وقت نظامی صاحب اکیلے ہی تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور قبول صورت نوجوان جو نظامی صاحب کا پوزیٹو تھا، وارد ہو گیا۔ نظامی صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا :

" شیخ حامد محمود "

میں نے ان کا نام بھی سن رکھا تھا۔ وہ مطبوعات نوائے وقت کے ہفتہ وار اخبار " قندیل " کے مینیجنگ ایڈیٹر اور " نوائے وقت " کے کاروباری انتظامات میں : ٹیکنیکل ڈائرکٹر تھے۔ میں نے تنقیدی نگاہوں ان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک قبول صورت نوجوان ہونے کے علاوہ نظامی صاحب کے رکھ رکھاؤ سے اُلٹ ہنس مکھ، باغ و بہار، خندہ جبیں اور خوش باش نوجوان تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نظامی صاحب اگر افتتاحیہ ہیں تو وہ مطائبات ہیں۔ وہ دونو یکجا ہو کر نوائے وقت بنتے تھے۔ اِتنے میں اور دوست بھی آنے لگے۔ ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ جو " ہفتہ وار نوائے وقت " کے زمانے سے ان کے جگری دوست تھے۔ شیخ خورشید احمد جنہیں بلبل ہزار داستان کہا جاتا۔ میاں بدیع الزمان ایڈووکیٹ جو خشک طبیعت کے زندہ دل انسان تھے۔ اس وقت تو انہی لوگوں سے تعارف ہُوا لیکن نظامی صاحب کے حلقہ احباب میں کمی بیشی ہوتی رہی آخری دس سال میں

جو لوگ ان کے ساتھ منسلک ہو گئے یا ان کی مجلس کے ارکان و جوارح کہلاتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر نسیم حسن شاہ، میاں محمد امین، مسٹر اصغر بھٹی، شیخ عطاء اللہ سجاد، اور میاں کفایت علی منفرد و ممتاز تھے۔ ان کے ساتھ گپ لگتی، لطیفے گھڑے جاتے، بذلہ سنجی ہوتی، ضلع جگت ہوتا، پھبتیاں اڑتیں، طعن و تشنیع کے غبارے چھوڑے جاتے، مطائبات کا سماں بندھتا، فکاہات کی بازی بدتے۔ فقرے تراشے جاتے، جملے وضع ہوتے، شاعری کا دور چلتا، خبریں آتیں، تبصرے ہوتے، رازہائے درونِ پردہ پر محاکمہ، خلوتیان راز کی چہرہ کشائی غرض لیاقت علی خاں سے لیکر خلیفہ امام دین بقا تک سب پر حاشیہ آرائی کی جاتی۔ انہی دنوں معلوم ہوا کہ نظامی صاحب انسانی اوصاف کا مجموعہ ہونے کے باوجود اپنے ذاتی اور سیاسی دونوں نسل کے دشمنوں کو معاف کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ ان کے متعلق نہ صرف ہر لحظہ چوکنا رہتے بلکہ جو کچھ ان لوگوں سے متعلق معلوم ہوتا اسے مزے لے لے کر بیان کرتے۔ انہیں بارہ مسالہ کی چاٹ اور سیاسی گفتگو میں مرچ مسالہ ڈالنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کے بغیر ان کی گفتگو ادھوری رہ جاتی۔ وہ اس میں خود ہی لطف محسوس نہ کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی بامزہ کرتے۔ جتنے نوائے وقت میں سنجیدہ، لئے دیئے، وضعدار اور الفاظ کے چناؤ میں سخت تھے اتنا ہی دوستوں کی محفل میں ہنس مکھ، بے تکلف، باغ و بہار اور الفاظ کی پتنگیں اڑا کر کاٹنے کے شوقین تھے۔ جبلی و خلقی عادت تھی کہ وہ کسی دوست کو بھی اپنے ساتھ بے تکلف نہ ہونے دیتے

ان کی زبان گالی گفتار سے محترز رہتی۔ وہ عیب ہیں بھی کچھ ایسے نہ تھے۔ لوگ ان کے کان میں باتیں ڈال جاتے وہ ان سے لطیفے اٹھا لیتے تھے۔ سب دوستوں سے ایک خاص دائرہ میں رہ کر ملتے۔ کبھی وضعداری سے ہاتھ نہ اٹھاتے۔ ان کے باہمی خطاب کرنے کا طریقہ انتہائی شریفانہ تھا۔ وہ کسی دوست کی ہتک نہ کرتے اور نہ بعض آوارہ منش دوستوں کی طرح کسی کا مذاق اڑا کر اپنی تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ اعلیٰ مذاق کے حدود میں رہتے اور ایک اعلیٰ درجہ کا مزاح پیدا کر کے دوستوں میں خوش رہتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان سفر میں کھل جاتا ہے جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے وہ مصیبت اور ہمسفری میں بے نقاب ہو جاتا ہے۔ نظامی، خوشی ہو یا غمی، رنج ہو یا راحت، سفر ہو یا حضر، مصیبت ہو یا عشرت جہاں بھی ہوں ایک سی طبیعت رکھتے تھے۔ انہیں شدید غصہ بھی آتا تھا اور اس وقت وہ کانپنے لگتے تھے۔ لیکن جب معمول پر ہوتے تو کبھی آپے سے باہر نہ ہوتے۔ ان میں بہ قولِ اقبال عرب کا سوزِ دروں اور عجم کا حسن طبیعت تھا۔ بہ قولِ غالب وہ دل گداختہ لے کر پیدا ہوئے تھے لیکن دشمنوں کے لئے نیزے کی اَنی تھے۔ قدرت نے انہیں اس شمشیر کی طرح رکھا تھا جو حریفوں کے سر کاٹتی اور دوستوں کی محافظ ہوتی ہے۔ وہ سبک سر ہو کر کسی سے بھی اس کی سرگرانی کا مطلب پوچھنے والے نہیں تھے بلکہ درِ کعبہ بند ہو تو اُلٹے پھر آتے تھے۔ وہ اپنوں کے لئے بوئے گل، پرایوں کے لئے نالۂ دل اور عمر کے آخری

دنوں میں دُو دِچراغ محفل تھے۔ انہوں نے منصور کے آوازۂ کہن کو ولولۂ تازہ دیا۔
دراصل وہ ان حدی خوانوں میں سے تھے جن کا طرۂ امتیاز تھا ؎

بیاور ید گر ایں جا بود زبان دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد،

ایک روز انہوں نے مجھے فون کیا کہ پی این ای سی کا سالانہ اجلاس اپریل ۱۹۵۰ء کو کراچی میں ہو رہا ہے وہاں چلنا ہے اپنی نشست ریزرو کرا لو اور اگر کسی معتمد اخبار نویس دوست کو بھی ساتھ لے جا سکتے ہو تو لے چلو۔

خیریت ہے، میں نے کہا۔

خیریت تو ہے لیکن خواجہ صاحب نے لاہور میں فلاں فلاں آدمی کو بھیجا ہے وہ "ایڈیٹر بھرتی" کر کے لے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا قابلِ اعتماد دوستوں میں صرف سید عطاء اللہ ہاشمی "اداکار" کے ایڈیٹر ہیں لیکن "اداکار" سیاسی نہیں فلمی پرچہ ہے۔ کہنے لگے پروا نہیں ساتھ لے لو۔ سنا یہی ہے کہ دوستوں کے دوست اور دبنگ آدمی ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کو تیار کیا گیا۔ لاہور سے ہم تینوں کے علاوہ مولانا اختر علی خاں، مسٹر امین الدین صحرائی وغیرہ بھی روانہ ہوئے۔ مولانا اختر علی خاں اور حمید نظامی فرسٹ کلاس میں تھے ہم سیکنڈ میں۔ نظامی صاحب دوستوں سے الگ سفر نہیں کرتے تھے۔ اصولاً انہیں ہمارے ساتھ ہی سفر کرنا چاہیئے تھا لیکن

اختر علی خاں کو رام کرنے کے لئے ان کے کمپارٹمنٹ میں سیٹ ریزرو کرالی تھی۔ راستے ونڈ پہنچ کر ہم بھی ان کے ڈبے میں چلے گئے۔ مولانا اختر علی خاں اپنے برتھ پر دراز چہچہا رہے تھے۔ زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت اگر ہم نے سیفٹی ایکٹ قبول کر لیا، خواجہ صاحب کے ہاتھ میں کھیل گئے اور خود سپردگی کا انداز اختیار کیا تو اس کا بدیہی نتیجہ صحافت کیلئے مہلک ہوگا۔ مولانا اختر علی خاں سر ہلا ہلا کر زور دار لفظوں میں تائید کر رہے تھے۔ امین الدین صحرائی بھی ہمنوا تھے۔ نظامی صاحب کو ان دونو پر یقین نہیں آتا تھا۔ ہم اس تذبذب سے قطعی طور پر آگاہ نہ تھے نظامی کا بیان تھا کہ خواجہ شہاب الدین کی طرف سے پیر علی محمد راشدی لاہور آکر مولانا اختر علی خاں کو ہموار کر گئے ہیں اور مولانا طبعاً ہَوا کے رُخ پر چلنے والے انسان ہیں۔ بہر حال ہم لوگ ہنستے کھیلتے اور وعدے وعید کرتے کراچی پہنچ گئے۔ کراچی پہنچ کر بیچ لگژری ہوٹل میں قیام کیا۔ صحرائی تو کہیں اور چلے گئے۔ لیکن مزید جگہ نہ ہونے کے باعث ایک بڑے کمرے میں ہم چاروں نے قیام کیا۔ مولانا اختر علی خاں تو کمرے کی اصل چارپائی پر دراز ہو گئے۔ دوسری پر نظامی صاحب نے میرا بستر لگوا دیا۔ تیسری چارپائی پائینتی کے رُخ پر بچھوا دی گئی وہ سید عطاء اللہ ہاشمی کے حصّہ میں آئی۔ چوتھی چارپائی کے لئے گنجائش ہی نہ تھی۔ نظامی صاحب نے کہا میں فرش پر بستر لگا لیتا ہوں۔ میں نے اور شاہ جی نے بہت زور دیا کہ آپ ہماری دو چارپائیوں میں سے ایک چارپائی لے لیں، لیکن کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ آخر فیصلہ یہ ہُوا کہ

ٹھیرنا ہی کے روز ہے تین روز کی بات ہے ہر روز ایک ساتھی فرش پر سولیا کرے
ہم تینوں باری باری فرش پر سوئیں گے۔ پہلے دن نظامی صاحب ہی نے فرش پر
سونے کا فیصلہ کیا۔ اور کسی قیمت پر بھی اپنے اس فیصلہ کو منسوخ نہ کیا ــ خیر ہوٹل
سے نہا دھوکر ہم لوگ نیچے ڈائننگ روم میں چائے پینے کے لئے آئے تو مولانا اختر علی
خاں خواجہ شہاب الدین کو فون کر رہے تھے، نظامی صاحب تاڑ گئے۔ اختر علی خاں
جلدی سے چائے پی کر جانے لگے تو نظامی نے کہا :

مولانا ! کہاں جا رہے ہیں آپ ؟

سیکرٹریٹ تک ،

کس سے ملنا ہے ؟

بھئی خواجہ صاحب کا فون آیا ہے۔ اُن سے مل آؤں

نظامی صاحب نے کہا۔ ٹھیر یئے، ہم بھی چلتے ہیں۔ آپ خواجہ صاحب سے
مل لیجئے گا ہم نیچے انتظار کریں گے وہاں سے قائد اعظمؒ کا مقبرہ دیکھنے چلیں گے :
ناخوشی سے مان گئے۔

ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹہ سیکرٹریٹ کی سڑک پر گھومتے رہے۔ مولانا اختر علی خاں خواجہ
صاحب سے ایسے نتھی ہوئے یا خواجہ صاحب انہیں اس طرح چپکے رہے کہ دونو
میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑتا تھا۔ نظامی صاحب ٹہلتے ٹہلتے ،
لطیفے چھوڑتے رہے کہ اس وقت یہ ہو رہا ہو گا ، خواجہ صاحب یہ فرما رہے ہوں گے

اور مولانا اس طرح حامی بھر رہے ہوں گے۔ نظامی صاحب سے نہ رہا گیا۔ اُنھوں نے خواجہ صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا کہ اختر علی خاں سے کہو، ہم لوگ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ جواب ملا کہ مولانا فرماتے ہیں آپ لوگ چلے جائیں، میں خود ہی آجاؤں گا۔ حمید نظامی نے کہلا بھیجا — جی نہیں، آپ جب تک ٹھیریں ہم آپ کے انتظار میں ہیں؛ پرائیویٹ سیکرٹری — کہنے لگا۔ مولانا اِس وقت خوش گپی فرما رہے ہیں؛ نظامی صاحب نے کہا۔ جی نہیں خواجہ صاحب انہیں شیشے میں اُتار رہے ہیں۔ اور ہم یہ شیشہ توڑ دینا چاہتے ہیں۔

آخرکار مولانا زاویہ قائمہ بناتے ہوئے واپس آگئے۔ نظامی نے پوچھا:

اِتنی دیر ؟

کہنے لگے۔ آپ جانتے ہیں خواجہ صاحب لمبی بات کرتے ہیں۔

نظامی صاحب نے کہا۔ کیا بات ہوئی ؟

کوئی خاص بات تو نہیں، والد صاحب قبلہ کا پوچھتے رہے۔ صحت کیسی ہے وغیرہ۔

حمید نظامی نے کہا۔ وغیرہ وغیرہ میں کیا تھا ؟

بس یہی کانفرنس کا ذکر کرتے رہے کہ ہم لوگ کسی اخبار پر سیفٹی ایکٹ نہیں لگانا چاہتے۔ بعض نا ہم قسم کے صحافی اخبار نکال کر بلیک میلنگ کرتے ہیں۔ ان کے مقدمات کو آپ ہی لوگوں پر مشتمل کمیٹی کے روبرو پیش کر کے ایکشن لیا جائے گا۔

نظامی صاحب کو اختر علی خاں کے قول وقرار بلکہ مزاج وطبیعت پر بالکل اعتبار نہ تھا وہ انہیں سیمابی انسان سمجھتے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ اختر علی خاں ٹرخا رہے ہیں۔ خواجہ صاحب نے انہیں ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اجلاس گیارہ بجے شروع ہو رہا ہے وہاں کھل جائے گا کہ اختر علی خاں کدھر جاتے ہیں۔ نظامی نے مولانا کو گرید نے کے بجائے بات آئی گئی کر دی۔ کہنے لگے۔ آیئے قائدِ اعظمؒ کی قبر پر چلتے ہیں ۔ وہاں پہنچے فاتحہ پڑھی۔ نظامی نے تجویز کیا کہ آیئے آپس میں ان کے مزار پر حلف لے لیں کہ ہم سیفٹی ایکٹ کے معاملہ میں اکھٹے رہیں گے۔ اور حکومت کا آلہ کار نہ بنیں گے۔ اس وقت وہاں ایک دوسرے ضلع کے دو تین صحافی اور بھی آ گئے تھے، ان میں سے ایک کا کرایہ بھی حمید نظامی نے ادا کیا تھا۔ میرے سوا ان سب دوستوں نے اختر علی خاں سمیت قائدِ اعظم کے مزار پر اللہ و رسول کو گواہ بنا کر حلف اُٹھایا۔ مجھ سے کہا گیا۔ تم حلف میں کیوں شریک نہیں ہوتے۔ میں نے کہا حلف میں شریک ہونے کا سوال نہیں۔ میری زبان ہی حلف ہے میرا عہد ہی قسم ہے۔ میں حنفی العقیدہ مسلمان ہوں قبروں پر حلف نہیں اٹھایا کرتا۔ میرے نزدیک یہ بدعت ہے۔

اجلاس شروع ہوا تو کارپوریشن ہال صحیح اور غیر صحیح اخبار نویسوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہم حیران تھے کہ اتنے اخبار نویس کہاں سے آ گئے۔؟ انہیں ٹکٹ کیسے جاری ہو گئے۔ لاہور ہی کے نام پر اتنے مندوب جمع تھے کہ خدا کی پناہ لائلپور سے ایک صاحب اور تشریف لائے تھے جو مجلس احرار میں رضا کاروں کے نائب سالار تھے اور اخبار نویسی

کی ابجد سے بھی ناواقف۔ بعض رکشا چلانے والے ایڈیٹر بن کر بیٹھے تھے۔ دو چار سی آئی ڈی کے اہلکار بھی مدیروں میں فروکش تھے۔ جہاں تک ان کا تعلق تھا، بہرحال وہ وقائع نگاری ہی کیلئے آئے تھے۔ الطاف حسین کی صدارت میں اجلاس شروع ہوا۔ ایک طرف پیر علی محمد راشدی لاؤ لشکر لئے بیٹھے تھے۔ دوسری طرف نظامی صاحب' ان کے ساتھ فیض، فیض کے ساتھ میں اور سید عطاء اللہ ہاشمی' پہلو کی نشست پر مولانا اختر علی خاں' ان کے ساتھ امین الدین صحرائی، اور ان کا ایک کھلونا جس سے میر تقی میر اپنی بیماری کے دنوں میں دوا لیا کرتے تھے۔

نظامی صاحب نے گزشتہ اجلاس کی رُوداد پڑھی اور اس مطلب کی قرارداد پیش کی کہ سیفٹی ایکٹ کا اخباروں پر استعمال غلط ہوگا۔ لہذا یہ اجلاس حکومت کے اس فیصلہ کی تائید نہیں کرتا۔ میں نے تائید کی۔ فیض احمد فیض نے تائید مزید۔ اس کے بعد قرارداد کی مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جس کو دیکھو حکومت کا ہمنوا ہے بھانت بھانت کے لوگ قرارداد کی مخالفت میں چہچہا رہے تھے۔ اگر ان لوگوں کو اخبار نویسوں کی صف میں شریک نہ کیا جاتا تو لازماً جیب تراش ہوتے۔ ان جیب کتروں نے سارا ہال سر پر اُٹھا لیا۔

- نظامی صاحب انتشار پسند ہیں؛
- شورش کاشمیری پاکستان کی تحریک میں نہیں تھے؛
- فیض احمد فیض کمیونسٹ ہیں؛

" سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی آئے نہیں لائے گئے ہیں"

نظامی صاحب بڑے تحمل سے یہ سارا ویاکھیان سنتے رہے۔ اُنہوں نے مولانا اختر علی خاں سے کہا کہ وہ اِس تو تکار کو سمیٹیں۔ لائلپور کا ایک ایڈیٹر جو نظامی صاحب سے کرایہ لے کر آیا تھا۔ وُہ بھی حکومت کے پلڑے میں چلا گیا۔ مولانا نے اٹھ کر پہلے تو خطبہ مسنونہ پڑھا، پھر اناپ شناپ بولتے رہے، آخر میں حکومت کے ہو گئے۔ اُلٹا ہم سے اپیل کرنے لگے کہ صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہم بھی حکومت کا ساتھ دیں۔

الٰہ العالمین یہ کیا؟ قائداعظم کی قبر پر آدھ گھنٹہ پہلے کا حلف گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو گیا تھا۔، لاہور سے کراچی تک کا سفر اکارت گیا، بیچ لگژری ہوٹل کے وعدے مر گئے۔ مولانا اختر علی خاں فرزندِ دل بند مولانا ظفر علی خاں ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

نظامی صاحب کو مولانا کی اس منافقت کا پہلے سے یقین تھا۔ انہیں سخت غصہ آیا۔ لیکن ہمیشہ کی طرح پی گئے۔ انہوں نے قرار داد کے حق میں وضاحتی تقریر کرتے ہوئے دلائل کا ایک انبار لگا دیا۔ میں نے اس سے پہلے ان کی ایسی نپی تلی، صاف ستھری، گٹی بندھی اور چاروں چول چوکس تقریر کبھی نہ سنی تھی۔ لیکن جن لوگوں کو وہ مخاطب کر رہے تھے ان میں ایک شخص بھی مخاطبت کے قابل نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ چھوٹے خواجہ کی چوکھٹ کے بھکاریوں سے ہمکلام ہیں جو ٹھیکروں کی

طرح بے حس و حرکت پڑے ہیں۔ آخر فیض نے ایک مختصر لیکن جامع تقریر کی جس کا مقطع یہ تھا کہ ہم لوگ تو اپنے گریبانوں کی حفاظت خود بھی کر سکتے ہیں یہ جو کچھ ہم کہہ رہے آپ کے لئے کہہ رہے ہیں۔ آپ افتاد پڑنے پر اپنے گریبانوں کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ لیکن کسی پر کیا اثر ہوتا؟ ان لوگوں نے اپنے قلم رہن رکھنے کا سودا کر لیا تھا۔ اور تل گئے تھے کہ اخبار بھاڑ میں جائیں انہیں تو وہی کرنا ہے جو خواجہ صاحب اعلی اللہ مقامہ فرما چکے ہیں۔ چنانچہ جب ووٹنگ ہوئی تو ہم صرف چار ووٹ ایک طرف تھے۔ باقی سب حکومت کے ساتھ۔ ان ایڈیٹروں میں نمایاں ایڈیٹر بھی تھے رکشا ڈرائیور بھی، پان فروش بھی، خوانچہ فروش بھی اور مغنیے بھی۔ جنہیں تیسرے درجہ کے اخبار نویس ذائقہ بدلنے اور ہاضمہ درست رکھنے کے لئے ساتھ لے آئے تھے۔

کانفرنس ہماری ہار کے بعد ختم ہوگئی۔ نظامی صاحب کو اختر علی خاں کی ماہیت قلب پر سخت افسوس تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اور اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فیض نے اور میں نے بعض خرافاتی مصرعے جوڑ کر مولانا کا قصیدہ لکھا جس میں دوسرے خود کاشتہ ایڈیٹروں کی بھی تعریف و ثنا کی گئی تھی۔ ان اشعار کو گنگناتے ہوئے ہم نیچ لگژری پہنچے، تو مولانا اختر علی خاں پہلے ہی سے کمرے میں دراز تھے۔ ہمیں دیکھ کر اونگھنے لگے گویا خواب میں ہیں۔ میں نے مذکورہ اشعار کو بلند آواز میں الاپنا شروع کیا۔ اختر علی خاں نے جب بار بار ایک ہی تبرّیٰ سنا تو فرمایا:

"جی ہاں میں سمجھتا ہوں یہ سب طبع آزمائی مجھ پر ہو رہی ہے۔"

"توبہ توبہ" نظامی نے خندہ زیرلبی سے کہا۔

"جی نہیں آپ مجھے بدھو سمجھ رہے ہیں" مولانا نے فرمایا۔

نظامی مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ انہوں نے مولانا پر ایک اور داؤں چلایا۔ "آئیے ملک تاج الدین ایسوسی ایٹڈ پریس کے ہاں چلتے ہیں۔ وہ تیار ہو گئے ـــ وہاں پہنچ کر یہی ذکر چھڑ گیا، ملک صاحب نے بھی مولانا کو سمجھایا۔ ہم بھی پیچھے پڑ گئے زمیندار بہت بڑا اخبار ہے، آپ کی عظیم روایات ہیں، مولانا ظفر علی خاں برگزیدہ راہنما ہیں ان کی تمام عمر اس قسم کے احتسابی قوانین کو چیلنج کرتے گزری ہے، لاہور چل کر ان سے قطعی فیصلہ کرا لیں گے۔ فی الحال آپ ان کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں اور بیان جاری کریں کہ آپ اس معاملہ میں حکومت کے ساتھ نہیں ہیں۔ مولانا پھر مان گئے۔ واپس لوٹے تو جاتے ہوٹل سے کہاں غائب ہو گئے۔ معلوم ہوا نیچے فون کر رہے ہیں۔ کسے کر رہے ہیں۔ کہنے لگے ایک دوست کو بلوایا ہے ادھر خواجہ صاحب کو اطلاع ہو چکی تھی۔ انہوں نے کراچی کے دو ہتھ چھٹ اخبار نویسوں اور امین الدین صحرائی کو بھیجا کہ مولانا کو لے آئیں۔ وہ فوراً ہی پہنچ گئے۔ اب وہ مولانا کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں ہم جانے نہیں دیتے۔ مولانا اچکن پہن کر تیار کھڑے ہیں۔ کھینچا تانی ہو گئی۔ صحرائی مولانا کو کھینچتا ہے چلئے قبلہ! ہم اپنی طرف کھینچتے ہیں، رک جائیے قبلہ! نتیجتہً صحرائی اور نظامی صاحب میں جھڑپ ہو گئی۔ صحرائی چٹا ان پڑھ ہونے کے علاوہ الم غلم طبیعت کا گبرو جوان تھا۔ اس نے نظامی صاحب کے گریبان

پر ہاتھ ڈالا۔ ہمارے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ عطاء اللہ ہاشمی نے ہاتھ مروڑ کر جھنجوڑا، وہ اول فول بکنے لگا۔ مَیں نے زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ دھینگا مشتی ہو گئی۔ ہم نے صحرائی کو خوب مارا۔ لیکن جب پٹائی کر چکے اور پلٹ کر دیکھا تو پتہ چلا کراچی کے دونو بھیّا اختر علی خاں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اور اختر علی خاں جا چکے ہیں۔ پنچ تک خبر آگئی کہ مولانا اختر علی خاں پی این ای سی کے سینئر نائب صدر ہو گئے ہیں۔

علی محمد راشدی صدر، اسی طرح کے دوسرے عہدیدار، مجلس عاملہ جن لوگوں سے بنی ہے ان کی اکثریت اضحوکہ روزگار ہے۔ نظامی صاحب، فیض صاحب، شاہ جی اور مَیں نے مشترکہ طور پر استعفیٰ لکھ کر بھیجدیا کہ ہم ایک ایسی جماعت میں رہنا نہیں چاہتے جو وزارتِ اطلاعات کے ہاتھ میں کھلونا ہے، جس نے اخبارات کے لئے سیفٹی ایکٹ کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے جسکے ارکان غیر اخبار نویس ہیں۔ اور جس کی تمام کارروائی شرمناک طور پر انجام پائی ہے۔

شام کو ٹاؤن ہال میں عصرانہ تھا۔ اس میں خواجہ صاحب اور شیخ محمد اکرام سی ایس پی جو اُن دنوں وزارتِ اطلاعات و نشریات کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ بعض دوسرے افسروں کے ساتھ شریک تھے۔ نظامی صاحب ان سب سے الگ تھلگ رہے۔ شیخ محمد اکرام نے نظامی صاحب کے پاس آکر کہا کہ خواجہ صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ خواجہ صاحب اس وقت کوئی چار گز کے فاصلہ پر ہوں گے۔ نظامی صاحب نے غصہ میں تپتے ہوئے الفاظ کو پھیلا کر انگلی

سے سوالیہ نشان بناتے ہوئے کہا " اس شخص کو روک دو۔ میرے ساتھ علیک سلیک بھی نہ کرے ———————— میں اس کو اخبارات کی آزادی کا قاتل سمجھتا ہوں اور اس سے ہرگز ہرگز ملنا نہیں چاہتا۔ شیخ اکرام صاحب اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔ خواجہ صاحب سُن ہو رہے اور اِدھر کی میز سے ہٹ کر اُدھر کی میز کے ٹکڑے پر چلے گئے۔ مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ نظامی صاحب کس جگر گردے کے انسان ہیں اور ان وزراء یا افسروں پر ان کی ہیبت کیا ہے۔ جو اخبار نویس حکومت کے ساتھ ہو گئے تھے، خود افسر اُن سے ملتے ہوئے سرد مہری برتتے بلکہ اختر علی خاں وغیرہ پر ہنستے تھے۔ لیکن ہر شخص نظامی کو احترام و اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

نظامی صاحب عصرانہ میں کوئی آدھ پون گھنٹہ شریک رہے۔ پھر وہاں سے ہمیں ساتھ لے کر ہوٹل میں آگئے۔ اور شاعری کا ڈول ڈالا۔ مصرع طرح انہوں نے تجویز کیا۔ میں نے بالبداہت ان صحافیوں کا قصیدہ کہہ ڈالا۔ اختر علی خاں منہ بنائے ہوئے تشریف لائے۔ بستر بندھوایا اور علیک سلیک کئے بغیر رخصت ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ لاہور چلے گئے ہیں۔ اگلے روز ہم بھی لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔

نظامی صاحب سے میں نے کہا۔ جن لوگوں کے سامنے کوئی آئیڈیل نہ ہو وہ یہی کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ حکومت کو الگ کر کے سوچ ہی نہیں سکتے۔ حکومت خواہ رنجیت سنگھ کی ہو خواہ خواجہ شہاب الدین کی قدرت نے ان لوگوں کے مقدر میں کاسہ لیسی

لکھی ہے۔ نظامی صاحب کو بعض لوگوں کی دریوزہ گری کا شدید احساس تھا۔ اب ان واقعات کی چہرہ کشائی نامناسب ہے۔ تاریخ بڑی بے رحم ہوتی ہے اس حمام میں کئی "برگزیدہ چہرے" ننگے ہوں گے۔ لاہور کے جن اخباروں نے پختہ وعدے کئے تھے۔ ان کے وعدے بھی ایشیائی معشوق کے روایتی وعدوں کی طرح کچا گھڑا ثابت ہوئے۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ حکومت کے ان خوشہ چینوں کا آہستہ آہستہ نام و نشاں مٹ گیا

راشدی ابو مسلم خراسانی کی طرح ہوشیار آدمی تھے وزیر ہو گئے۔ سفیر بن گئے قلم کو ہاتھ میں رکھا لیکن ان کا اپنا اخبار وقت کے ساتھ نذرِ اجل ہو گیا۔

مولانا اختر علی خاں ختم نبوّت کی تحریک میں بیس سال قید ہوئے۔ گرگرا کے نکلے تو "زمیندار" کٹے ہوئے پتنگ کی طرح تھا حتیٰ کہ اس کی ناؤ بھی ڈوب گئی۔

امین الدین صحرائی جواں مرگ ہو گئے۔ دو ورق کا "نظامِ جدید" ان کا اخبار تھا اس کو بھی موت چاٹ گئی۔

"آفاق" ہفتہ وار سے روزانہ ہوا۔ حالت اس کی یہ ہو گئی ع

کہ آں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

بالآخر ختم ہو گیا۔

روزنامہ "احسان" کا شعلہ کجلا گیا۔ ان کے علاوہ بعض بے قلم صحافی جو اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے اس طرح گُم ہو گئے جس طرح بن بلائے مہمان بیٹھ

پوجا کے بعد پرات سے غائب ہو جاتے ہیں۔

" نوائے وقت" پر بھی دولتانہ وزارت کے زمانہ میں افتاد آئی۔ لیکن وہ ققنس کی طرح اپنی خاکستر سے زندہ ہوتا رہا اور حمید نظامی کے استقلال و پامردی کی بدولت عامۃ الناس کا ہیرو بن گیا۔ حمید نظامی اپنی انہی روایتوں کے باعث مرکر بھی زندہ ہیں۔ اور " نوائے وقت آج تک آتشِ نمرود میں گلزارِ ابراہیم بنا ہوا ہے۔ فیض نے مختلف عنوانوں سے طویل قیدیں کاٹیں، لیکن ہر امتحان میں سرخرو ہو کر نکلے۔ ان کا قلم رواں دواں ہی رہا ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

" پاکستان ٹائمز" اور" امروز" کو مارشل لا نے ہتھیا لیا۔ لیکن اس کا مالک ٹوٹ گیا لچکا نہیں،

" چٹان" کے خلاف اس وقت کے ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ نے دھوپ چھاؤں کے درخت کی ایک ٹہنی کے پتے کو سرسبز کرنا چاہا۔ قلمی معرکہ ہو گیا اس ہفتگی نے تعلقات عامہ سے روپیہ اور کاغذ لے کر اپنی خاندانی آبرو کے جوہر دکھائے۔ چٹان نے آڑے ہاتھوں لیا تو سیفٹی ایکٹ کے تحت فوراً ہی ایک سال کے لئے بند کر دیا گیا۔ اس اثنا میں کئی دفعہ ایڈیٹر چٹان کو پیشکش کی گئی کہ قبل از وقت پابندی ہٹائی جا سکتی ہے۔ لیکن ایڈیٹر چٹان نے رسید تک نہ دی

اس کی جگہ ہفتہ وار "عادل" نکلتا رہا۔ نتیجہ معلوم ہی تھا کہ ؎

وزارتیں تو کھلونا ہیں ٹوٹ جائیں گی
چٹان آئے گا اور بالضرور آئے گا

چٹان سال بھر کی بندش کے بعد دوبارہ جاری ہو گیا۔ دولتانہ وزارت ختم نبوت کی تحریک میں اپنے گناہوں کی چتا ہو کر بھسم ہو گئی۔

سنہ ۱۹۵۰ء کی ابتدائی سہ ماہی میں نظامی سے میرے تعلقات کی سطح بلند اور عمیق ہو گئی۔ ان پر روز بروز کھلتا رہا کہ جس شخص کے ساتھ انہوں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے وہ ان کے پرانے قلمکار دوستوں کی بہ نسبت راسخ العقیدہ اور صادق العہد ہے۔ مجھ پر بھی ان کی خوبیاں کھلنے لگیں۔ محسوس ہوا کہ ان کی دوستی فخر و ناز کا سرمایہ اور ان کی دشمنی انتہائی خطرناک ہے۔

انہیں عصر کے وقت ریستورانوں اور ہوٹلوں میں محفل لگانے کا بہت شوق تھا۔ مغرب کی نماز کے وقت اٹھ جاتے۔ کچھ دوست اپنے موٹروں میں گھروں کو چلے جاتے۔ بعض دوست انکے یا اپنے موٹر میں اکھٹے سوار ہو کر چھاؤنی تک سیر و تفریح کرتے۔ یہ گویا روزمرہ کا معمول تھا۔ جن دوستوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ان میں ابو صالح اصلاحی کوہستان میں شامل ہونے تک شریک رہے۔ جن سے انہیں تعلق خاطر تھا ان میں ایک ڈاکٹر شبر حسن تھے دوسرے ڈاکٹر بشر حسن۔ یہ دونوں سگے بھائی ہیں۔

اوّل الذکر ڈاکٹر اور ہیلتھ سروس میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ آجکل یو این او کی طرف سے سکندریہ میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے بڑے افسر ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن، انجنیئر ہیں۔ پہلے انجنیئرنگ کالج میں پروفیسر تھے۔ پھر انجنیئرنگ یونیورسٹی میں عہدیدار ہو گئے لیکن پہلے ہی وائس چانسلر سے ان کی کھٹ پٹ ہو گئی استعفیٰ دے کر الگ ہو گئے۔ آجکل سول انجنیئرنگ کا ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ یہ دونو بھائی نظامی مرحوم کے زمانۂ طالب علمی سے دوست تھے۔ ان کا تعلق خواجہ الطاف حسین حالی کے خاندان سے ہے۔ خواجہ غلام السیدین بھی ان کے عزیز ہیں اور بہت سے اقربا حکومت میں مختلف عہدوں پر مامور ہیں۔ ان دونو بھائیوں میں شرافت، اخلاق، سیر چشمی، دوست داری اور اخلاص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ انہیں ملنے جلنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندانی لوگ کیا ہوتے ہیں اور خون کی نجابت انسان کے افکار و اذہان پر کس طرح اثر ڈالتی ہے۔ نظامی مرحوم نے انہیں اپنے گھر کا فرد بنا رکھا تھا۔ اور یہ بھی گھر ہی کے ایک فرد کی طرح محبت اور احترام کرتے تھے۔

احباب کا یہ گروہ تھا جو نظامی گروپ سے منسوب ہوتا۔ شام کو ہوٹل میں جو بل بنتا اس کی ادائگی کبھی نظامی اور اکثر و بیشتر میاں محمد امین کرتے۔ لیکن آخر میں میاں محمد امین نے یہ صرفہ بہ اصرار اپنے ذمّے لے لیا تھا۔ کیونکہ وہ تمام احباب میں کروڑ پتی اور ملک کے چند گِنے چُنے صنعت کاروں میں سے تھے۔ اِن دوستوں کے علاوہ اور دوست بھی مِلنے کے لئے چلے آتے مثلاً نواب ممدوٹ، میاں امیر الدین اور

میاں عبدالباری، لیکن ان کا پھیرا مسافرانہ ہوتا۔ نیشنل اسمبلی کے موجودہ سینئر ڈپٹی اسپیکر چودہری فضل الٰہی اور میاں عبدالرب ڈپٹی سیکرٹری مالیات بھی باقاعدگی سے شامل ہوتے لیکن ان کے ناغے بھی طویل ہو جاتے۔ افسروں میں مسٹر این ایم خاں اور مسٹر لے ڈی اظہران کے دوست تھے۔ حکمرانوں میں میاں مشتاق احمد گرمانی کیساتھ ان کا برادرانہ تعلق تھا۔ چودہری محمد علی کے ساتھ بھی ان کا دوستانہ علاقہ تھا ـــ اور دونو میں گاڑھی چھنتی تھی۔ بعض افسر اور وزرا بھی ان سے میل ملاپ رکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ لیکن زیادہ ان سے خوف زدہ رہتے۔ ان کے قلم نے حکومتی اعوان و انصار کو لرزا رکھا تھا ـــ احباب کا یہ حلقہ ہر لحاظ سے ایک چنیدہ حلقہ تھا۔ میرا خیال ہے اس زمانہ میں کسی عیب یا غرض کے بغیر ان دوستوں کا یہ گروہ اخلاص و مہر کا ایک معجزہ تھا۔ اور ہاں نظامی مرحوم کے ان دوستوں میں خواجہ عبدالرحیم اور راجہ حسن اختر بھی شامل تھے۔ لیکن ان کی آمد و رفت روزانہ نہ تھی۔ جی چاہا تو ہفتہ عشرہ آتے رہے نہ چاہا تو مہینوں غائب ہو گئے۔

اس حلقہ میں ہوتا کیا، ثقہ اور غیر ثقہ افواہوں کی چھان پھٹک، سیاسی واقعات کی کھتونی، حزب اقتدار کے تضادات سے آشنائی، حزب اختلاف کی بوقلمونیوں کا ماتم یا پھر بذلہ سنجی۔ نظامی صاحب اس اشہب کے شہسوار تھے - شیخ خورشید احمد سے خدا کی پناہ وہ فقرہ بازی میں ید طولیٰ رکھتے۔ زبان ان کی کترنی کی طرح چلتی۔ انگریزی اس طرح بولتے جس طرح آبشار بہتا ہے۔ پھبتی کسنے سے بھی نہ چُوکتے ـــ میرے

تھی۔ جہاں تک دفتر کے نظم و نسق کا تعلق ہے۔ نظامی صاحب نے سارا کام ان کے سپرد کر رکھا تھا اور وہ برابر کے ڈائریکٹر تھے۔ نظامی شاذ و نادر ہی دفتر جاتے۔ گھر ہی سے اداریہ وغیرہ لکھ کر بھیج دیتے۔ ہدایات بھی گھر سے جاتیں یا کوئی ضروری بات ہوتی تو فون سے کہہ دیتے۔ نظامی کو حامد پر اور حامد کو نظامی پر جی جان سے بھروسہ تھا، پھر جانے کیا پیچ پڑا کہ دونوں میں کٹی ہو گئی۔ اور اس طرح ایک طویل پرخلوص بے داغ دوستی رنجیدہ حالات میں ختم ہو گئی۔ نظامی صاحب کے اعصاب کا یہ حال تھا کہ وہ اس مفارقت کو محسوس کرتے ان کی طبیعت میں غصہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن جب تک تکدر رہا اور یہ تکدر کوئی چار ماہ رہا۔ نظامی صاحب نے کسی دوست کو مطلع نہ کیا اور نہ کسی کو کانوں کان خبر ہوئی کہ دونوں میں کشیدگی ہے۔ آخر ایک روز حامد محمود مجھے دفتر سے اٹھا کر راوی کے کنارے لے گئے اور وہاں باہمی کشیدگی کا پس منظر بیان کیا۔ میں نے سُنا تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ نظامی صاحب نے جب خود ہی ذکر نہ کیا ـــــ اور نہ کسی دوست کے علم میں تھا کہ فلاں چیز ہو رہی ہے، تو ان سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ بہرحال میں نے بات کی۔ نظامی صاحب نے رنجش کا اعتراف کیا لیکن بات اس فقرے پر ختم کر دی کہ اس قسم کے زخم وقت کے ساتھ بھر جایا کرتے ہیں۔ حامد سے کہو کام کرتا رہے۔ ایک دن دلوں کا غبار دُھل جائیگا۔ لیکن اچانک معلوم ہوا کہ دونوں میں جدائی ہو گئی ہے۔ حامد نے نوائے وقت پر سٹرز سنبھال لیا۔ حمید نظامی کے حصّہ میں "نوائے وقت" آ گیا۔ ایک دوست نے مجھ سے

پوچھا، ان دو نوں میں اختلاف کیوں ہو گیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ایک کی خودی اتنی بالا ہو گئی ہے کہ خدا بن گئی ہے اور دوسرے کی خودی نے اب آنکھیں کھولی ہیں

نظامی صاحب کی ریستوران پسندی کے سلسلے میں بعض باتیں خاصی دلچسپ ہوتی تھیں۔ مثلاً ہمیشہ اوچھے اور نامور ہوٹل کے کونے میں بیٹھتے۔ ان کی کرسیاں اور میز مخصوص ہوتے۔ گفتگو دوستانہ نوعیت کی ہوتی۔ کبھی نوائے وقت کے اداریوں پر بات چیت نہ کرتے۔ نہ کسی کو پوچھنے کا حوصلہ تھا کہ کل کیا آ رہا ہے نہ خود کسی کو بتاتے کہ کیا لکھ کر آئے ہیں۔ خود ہی اس بارے میں کچھ کہہ دیا تو بہتر، ورنہ ما بخیر و شما سلامت۔

اکبر الہ آبادی کا مصرع ہے ؎

کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے ہسپتال جا کر

تو اس کا نصف اوّل اُن پر صادق آتا تھا۔ طالب علمی کے دنوں میں عرب ہوٹل کو آماجگاہ بنائے رکھا۔ طالب علمی سے نکلے تو چینی لنچ ہوم میں کچھ دیر بیٹھتے رہے۔ وہاں سے کافی ہاؤس کو دوپہر کی گپ زنی کا اڈہ بنایا۔ لیکن وہاں زیادہ دیر تک نہ سکے۔ ان کا خیال تھا کافی ہاؤس میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہیں شرم و حیا نہیں، احساس سے معرّیٰ لوگ ہیں۔ سیاست فروشی کرتے اور تن پروری پر جیتے ہیں۔ نصف سے زیادہ سی آئی ڈی کے دست نگاہ ہیں، بیشتر سیاستدانوں کے جاسوس ہیں، اکثر

محض زبان کے نخرہ باز ہیں۔ کئی ایسے ہیں جن کے قول و فعل میں احساسِ غیرت کا فقدان ہے۔ میں آخری دنوں میں انہیں کافی ہاؤس کھینچ کھانچ کے لے جاتا۔ یا وہ مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے وہاں چلے آتے۔ لیکن کافی ہاؤس کے ماحول سے انہیں طبعی نفرت تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اس شب برات کی پھلجھڑیاں ناقص، اس کے پٹاخے خام اور اس کی مہتابیاں بے رنگ بلکہ بدرنگ ہیں۔

"نوائے وقت" روزنامہ ہوا تو دفتر کے تلے لورینگ ہوٹل تھا جہاں آج کل پی آئی اے کا دفتر ہے، اسی کے ہو گئے۔ لورینگ دیوالیہ ہو گیا تو میٹرو میں مجلسیں لگانے لگے۔ مگر اس کی عمر بھی ختم ہو گئی وہاں سے اٹھ کر کسینو کو ڈیرہ بنایا۔ اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ میاں محمد امین کے دفتری پہلو میں گارڈینیا کھلا تو وہاں محفل آرائی شروع کی۔ بعض لوگ مذاق سے کہا کرتے تھے کہ نظامی صاحب اور ان کا گروپ جس ہوٹل میں جاتا ہے وہ کچھ دیر کے بعد غفرلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن گارڈینیا کے بعد وہ کسی ہوٹل میں نہیں گئے۔ ایک روز شام کو حسبِ معمول وہاں سے نکلے۔ صبح کو دل کا دورہ پڑا۔ تیسرے روز خلد آباد کے ہوٹل میں چلے گئے۔ جہاں ان کے کسی دوست کا جانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فرشتۂ اجل بلا دا لے کر نہیں آتے ہیں۔

لاہور سے باہر جس شہر میں جاتے بڑے سے بڑے ہوٹل میں ٹھیرتے۔ ان کا اصول تھا پہنو اچھا، کھاؤ سادہ، ٹھیرو باوقار ہوٹل میں یا کسی ایسے دوست کے ہاں جو ہر لحاظ سے معزز ہو۔ جب واپس آؤ تو ملازم یا بیرہ کو زیادہ سے زیادہ ٹپ دو تاکہ اُس کے

دل میں تمہارے لئے احترام پیدا ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ چھوٹے ہوٹلوں کا رُخ نہیں کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ کھانے پینے کے لئے وہ ہمیشہ دوسرے درجے کے ہوٹلوں کا چناؤ کرتے تھے۔ جیسا کہ شروع ہی میں لکھا ہے وہ کباب کھانے کے لئے چونا منڈی کے خلیفہ کی ہٹی پر چلے جاتے اور قبر نما چبوترہ پر بیٹھ کر کباب کھاتے، کانجی پیتے اور خوش ہوتے تھے۔ کبھی کبھار دفتر چٹیان میں آجاتے، محمد حسین سے کہتے کہ قلعہ گوجر سنگھ کے چوک سے مرغ چھولے لے آؤ۔ وہ دوڑ کر چھولے لے آتا۔ اور نان کے ساتھ خوب مزے سے کھاتے۔ ہریسہ کھانے کا بھی انہیں بہت شوق تھا۔ شیخ عنایت اللہ بٹ سے عموماً ہریسہ پکوا کر منگواتے۔ شیخ صاحب نے کھوئے کے کبابوں — کا ایسا چسکا ڈالا کہ خلیفہ کے کباب بھول گئے۔ ہفتہ میں ایک دو بار ان کے ہوٹل میں فون کر کے چودھری محمد شریف سے کباب منگوا لیا کرتے۔ پھل کھانے کا انہیں کچھ زیادہ شوق نہیں تھا لیکن آم غالبؔ کی طرح کھاتے تھے — دوستوں کی دعوتوں میں بڑی خوشی سے شریک ہوتے۔ بلکہ ان کا اہتمام کراتے۔ بسا اوقات مہینہ کے مہینہ لاہور سے باہر دوستوں اور ان کی بیویوں کے ساتھ سیر کو جاتے۔ وہاں کئی کئی کھانے پکائے جاتے۔ اچھی خاصی پک نک ہو جاتی اپنے گھر پر کسی کو کھانے پر مدعو نہیں کرتے تھے۔ جس کو دعوت دیتے ہوٹل میں انتظام کرتے۔ لیکن شاذ ہی کسی خوش قسمت کو کھانے پر بلاتے تھے۔

سماع کا انہیں بہت شوق تھا۔ اور یہ شوق مارشل لاء کے زمانے میں

زیادہ ہوگیا تھا۔ لیکن قوالوں کو ایک پھوٹی کوڑی نہیں دیتے تھے۔ طبیعت میں جز رسی تھی لیکن دو باتوں میں حیرت انگیز فیاضی پائی جاتی۔ اولاً مرحوم دوستوں کی اولاد کو کچھ نہ کچھ ماہانہ دیتے اور اس کی خبر کانوں کان کسی کو نہ ہوتی۔ دوسرے نادار طلبأ کو بشرطیکہ ان میں ہونہاری کے آثار ہوں، فیسیں اور داخلہ التزام سے دیتے۔ ان کی بدولت بہت سے طالب علم پروان چڑھے۔ جس دن اُن کا جنازہ اٹھا اس دن زیرِ تعلیم اور فارغ التحصیل طلبار کے رونے دھونے سے اندازہ ہوا کہ وہ کتنے مخیر تھے۔ وُہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے پیرو تھے کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو علم نہ ہو۔ اکثر لوگوں کی دستگیری کرتے۔ انہیں ملازمت دِلواتے ان کی سفارشیں کرتے اور اگر کسی مشکل کو جائز سمجھتے تو اس کے حل کرنے میں معاون ہوتے۔ سانگلہ ہل چونکہ اُن کا آبائی قصبہ تھا اِس لئے وہاں سے جو طالب عِلم مٹرک الیف اے، بی اے کر کے نکلتا اس کو ملازمت دِلوانا اپنا شعار بنا رکھا تھا۔

ایک دِن گجرات کا ایک طالب علم جس کا والد معماروں میں کام کرتا تھا میرے پاس آیا اور کہا کہ میں نے وظیفہ پا کر میٹرک پاس کیا اور راولپنڈی ڈویژن کے طلبار میں فرسٹ آیا ہوں۔ میری والدہ کے پاس صرف ایک روپیہ تھا وہ مجھے اس نے کرائے کے لئے دیا ـــــ کہ لاہور جا کر قسمت آزمائی کرو۔ پڑھنے کا مجھے شوق ہے لیکن وسائل مرے سے مفقود ہیں۔ میں نے مختلف دروازوں پر دستک دی ہے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ گجرات میں سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکرٹری بھی رہا ہوں ـــــــ

میاں افتخارالدین کے ہم خیالوں کا ہمنوا تھا۔ اسی خیال سے میں میاں صاحب کے دولت کدہ پر گیا۔ کہ کالج میں میرے داخلہ کے متعلق شاید امداد بہم پہنچائیں، لیکن اوّل تو ان کے ملازموں نے کوٹھی میں گھسنے نہیں دیا۔ جب میں نے شور مچایا تو مجھ پر کتّے چھوڑ دیئے۔ یہ میرے دائیں ہاتھ پر کتّے نے کاٹ کھایا ہے۔ میو ہسپتال سے پٹی کروائی ہے۔ سوچ سانچ کر آپ کے پاس آیا ہوں اگر آپ میری مدد کر سکتے ہوں تو تمام عمر شکر گزار رہوں گا۔ میں نے کل صبح سے روٹی بھی نہیں کھائی ہے۔"

نظامی صاحب چونکہ طلبار کی امداد میں پیش پیش رہتے تھے۔ فون پر ان سے سارا قصّہ کہا۔ کہنے لگے اس کو ساتھ لے کر میرے پاس چلے آؤ۔ ان کے مکان پر پہنچا۔ طالب علم نے کاغذات دکھائے۔ تو ششدر رہ گئے کہ افلاس کے ہاتھوں کیسے کیسے نوجوان ذبح ہو جاتے ہیں۔ بہر حال انہوں نے ڈیڑھ دو سو روپے داخلہ دے کر طالب علم مذکور کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے دیا اور اس سے وعدہ کیا کہ جب تک اس کا وظیفہ نہیں ملتا وہ اس کو باقاعدہ فیس دیتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ پچاس روپے ماہانہ جیب خرچ۔ شیخ خورشید احمد نے کتابیں لے دیں۔ سیّد ہادی علی شاہ نے نظامی صاحب کے ایماء پر سوٹ سلوا دیئے۔ میری ڈیوٹی یہ لگی کہ میں اس نوجوان کو اپنی کوٹھی میں ایک کمرہ دے دوں اور دو وقت کھانا۔ یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ سال چلتا رہا۔ ایک دن میں نے اس نوجوان کے نام کا ایک خط کھولا۔ تو گجرات کے ایک کمیونسٹ کی طرف سے تھا۔

" پیارے دوست!

نظامی اور شورش دونو رجعت پسند ہیں۔ ان کے خیالات کبھی قبول نہ کرنا۔ ایک صحافی ہے ایک مقرر، دونو واجب القتل ہیں۔ اپنے داؤں پر لگے رہو۔ جیسا کہ تم نے لکھا ہے پڑھ پڑھا کر اپنی راہ پر چلے آنا۔ فی الحال ان کا مال کھاؤ۔ ان لوگوں کا مال کھانا ہر لحاظ سے جائز ہے۔ یہ مال ان کا نہ سمجھو۔ تمہارا اپنا مال ہے۔ کیونکہ ہر ری ایکشنری کا مال ریولیوشنری پر حلال ہوتا ہے۔"

میں نے یہ خط اس نوجوان کو بھی پڑھوا دیا۔ اس کے طوطے اڑ گئے۔ الٹی سیدھی تعبیریں کرنے لگا۔ لیکن میں نے مسکرا کے اس طرح ٹال دیا گویا اس خط سے میں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ شام کو حسب معمول نظامی صاحب سے ملا تو ان سے ذکر کیا۔ وہ خط پڑھ کر چپ ہو گئے۔ پھر انہوں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ کل یہ نوجوان میرے پاس آیا تھا کہ میرے لئے شورش صاحب کے بجائے کسی اور جگہ رہنے کا انتظام کرا دو۔ میں نے پوچھا وہاں کیا تکلیف ہے؟ کہنے لگا تکلیف صرف اتنی ہے کہ ان کے ہاں ہفتہ میں دو بار دال پکتی ہے۔ دال کھانے کا میں عادی نہیں مجھے دو روز بازار سے سالن لا کے کھانا پڑتا ہے۔

نظامی صاحب نے کہا۔ تم معمار کے بیٹے ہو؟ اور وہی ہو؟ جس نے کہا تھا۔ کہ میری ماں نے مجھے اپنی کل کائنات ایک روپیہ دے کر لاہور بھیجا تھا۔ اور پیاز کے ساتھ دو روٹیاں باندھ دی تھیں لیکن اب تمہیں دال نہیں پچتی۔" نظامی صاحب یہ بتا کر پھر

کچھ دیر کے لئے سوچ میں ڈوب گئے. فرمایا:

"اس نوجوان کو فوراً گھر سے نکال دو۔ یہ کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے"

میں نے ایک روز کی مہلت دی تاکہ اپنا انتظام کر سکے. دوسرے روز وہ چلا گیا. لیکن کسی بورڑوا کامریڈ نے اس کی مدد نہ کی. وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر ٹیلیفون کے محکمہ میں ملازم ہو گیا۔ وہاں ٹریڈ یونین بنوا کر ہڑتال کروا دی. آجکل نہ جانے کہاں رہ رہا ہے۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ نظامی صاحب کمیونزم کے سخت مخالف اور کمیونسٹوں کے سخت دشمن تھے. کمیونسٹوں کو بھی ان سے خدا واسطے کا عناد تھا. اور وہ ان کے خلاف ہر طرح کا جائز و ناجائز پراپیگنڈہ کرتے تھے. کمیونزم کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ ایک دہشت پسندانہ نظریہ ہے جو انسان سے اس کے غور و فکر کی صلاحیتیں سلب کر کے اسے ایک فولادی نظریئے کا خود پہناتا ہے. وہ علی الاعلان کہتے تھے کہ کمیونزم میں اگر عوام دوستی ہے تو روس، امریکہ اور برطانیہ کی طرح اپنے دروازے عام سیاحوں پر کیوں نہیں کھولتا. ؟ انہوں نے ایک دفعہ خود بھی روس جانے کی غایت درجہ کوشش کی. لیکن کراچی سے لے کر لندن تک کے روسی سفارت خانوں نے دوٹوک انکار کیا۔ وہ خیال کی آزادی کے سب سے بڑے حامی تھے. اور کمیونزم کے خلاف ان کا چارج شیٹ یہی تھا کہ وہ خیال کی آزادی کو سلب کر کے انسان کے دماغ کو سوچنے سے روک دیتا ہے. وہ اس کی حکائتیں اور روائتیں بھی سنایا کرتے تھے. ان کے نزدیک

جمہوری نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں تھا۔ البتہ وہ اس کے مزاج میں اسلامی روح داخل کرنے کے زبردست حامی تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پاکستان کی اصل طاقت اسلام ہے۔ اگر ہم لوگوں نے اسلام سے بدعہدی کی تو اسلام ہمیں معاف نہیں کرے گا۔ پاکستان میں محض معاشی آسودگی کی لہریں ہی کامیابی کا ذریعہ نہیں بن سکتی ہیں بلکہ پاکستان میں اسلامی روح، سیاسی اور معاشی آزادی کا جزو لاینفک ہو کر ہی ایک صحت مند معاشرہ پیدا کر سکتی ہے۔ کمیونسٹوں کے بارے میں ان کے خیالات انتہائی خراب تھے۔ وہ انہیں کبھی عزت سے یاد نہ کرتے اور نہ عزت سے ان کا نام لیتے۔ لیکن ایک شخص ان میں ایسا ضرور تھا جس کی عزت کرتے اور وہ تھے سی آر اسلم۔ اس نوجوان کے وہ کلاس فیلو رہے تھے لہٰذا اپنے مطالعہ اور مشاہدے کی بنیاد پر کہتے تھے کہ اسلم نہ صرف عقیدۃً کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اپنے نظریے میں وہ انتہائی مخلص، حد درجہ سمجھدار، بے غرض کارکن اور ہمہ تن قربانی و ایثار ہے۔ اس کے علاوہ جس کمیونسٹ کا پاکستان میں نام لیا جاتا وہ اس کی رام کہانی سنا دیتے تھے۔ انہیں کمیونسٹوں سے اتنی نفرت تھی جتنی نفرت قائدِ اعظم کو کانگرس سے تھی۔ وہ انہیں بالغ سیاست کا نابالغ بچہ کہتے تھے۔

سماع کا ذکر ادھورا رہ گیا، وہ صرف عارفانہ کلام یا کسی شگفتہ غزل کو خوبصورت آواز میں سننا پسند کرتے تھے۔ غالب کے فارسی کلام سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ غالب کے فارسی دیوان کو کوئی بلند پایہ فارسی دان جو علم شعر میں دستگاہ

رکھتا ہو، مرتب کر دے تو اس کا ایک مصحح ایڈیشن شائع کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں وہ مختلف نام لیتے تھے لیکن میں نے انہیں مولانا غلام رسول مہر کے نام کا مشورہ دیا۔ وہ تیار ہو گئے کہ ان سے مرتب کرا کے مکتبۂ نوائے وقت کے زیرِ اہتمام شائع کریں۔ مگر اس سے پہلے خود ان کے دیوان زندگی کا مُتت بالخیر ہو گیا۔

انہیں پنجابی شاعری کے متصوفانہ کلام سے بڑی دلچسپی تھی۔ قوالوں سے بھی پنجابی کلام کی فرمائش کر کے بلھے شاہ کے دوہے اور حیدر علی کی کافیاں گواتے۔ سلطان باہُو کے کلام پر تو بچھ جاتے تھے۔ آخری دنوں میں جب مارشل لار کی گھٹن بہت بڑھ گئی۔ اور یہ ایک رات طویل سے طویل ہو گئی۔ تب انہوں نے سلطان باہو کے کلام کے بعض ابیات کو اپنے حافظہ میں اتار لیا تھا۔ عموماً گنگنایا کرتے۔ اپنی آواز تو ان کی واجبی ہی تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔ تو وہ اپنی بھو کی آواز میں سلطان باہو کے بعض مصرعوں کو کثرت سے گنگناتے۔ بلسا اوقات حیرت ہوتی کہ ایسا شخص جو اونچی آواز نہیں نکالتا اور بازار میں چلتے وقت کھلے منہ بات نہیں کرتا۔ فٹ پاتھ پر گنگناتا جا رہا ہے ؎

گلیاں دے وچ پھرن نمانے لالاں دے ونجارے ہُو
توڑی مار اُڑا نہ باہو اساں آپ ہی اُڈن ہارے ہُو

موت کی ناگہانی آمد سے مہینہ بھر پہلے وہ "توڑی مار اڑا نہ باہو اساں آپ ہی اُڈن ہارے ہُو"۔ اس گداز سے گنگناتے رہے کہ ان کی دل شکستگی کے آثار

صاف محسوس ہوتے تھے۔ ان کے ادبی خیالات میں وقتاً فوقتاً انقلاب آتا رہا۔ بایں ہمہ وُہ غالبؔ کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے۔ حالیؔ کو ہندوستانی مسلمانوں کا مرثیہ خواں۔ اکبرؔ الہ آبادی کو شاعرِ طنّاز، شبلیؔ کو مورخ، شاعر اور ادیب۔ مولانا ظفر علی خاں کی بداہتوں کے بہت زیادہ قائل تھے۔ فرماتے "افسوس آزادی کے بعد سیاسی خانہ ویرانی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ قومی صحافت میں ایک بھی ظفر علی خاں نہیں رہا۔

ظفر علی خاں خود ایک انجمن تھے۔ جب مسلمانوں کا کوئی مسئلہ چھڑتا وہ موچی دروازہ کے باہر خود ہی کرسیاں، دریاں، میزیں اور گیس لگوا کے مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جمع کر لیتے تھے۔ اب سارے ملک میں قحط الرجال ہے۔"

علامہ اقبال کی شاعری کے ایک حصّہ کو لافانی ایک کو طویل المیعاد اور ایک کو محض شاعرانہ اپج سمجھتے تھے مگر ان کا یقین تھا کہ مسلمانوں نے اس صدی میں اُن سے بڑا صاحب نظر پیدا نہیں کیا۔ عام شاعروں میں وہ کسی پر ایمان نہ لاتے تھے۔ صرف ان کے شگفتہ اشعار کی داد دیتے اور معاملہ ختم کر دیتے تھے۔

سماع میں بھی وہ مردانہ آواز کو پسند کرتے ـــــ پکّے راگوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ نظم آزاد، اشتراکیت، پکاسو کی مصوری اور پکا راگ مسلمانوں کی تہذیبی شائستگی کے خلاف ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا اپنا چہرہ مہرہ بھی پکا راگ ہی تھا۔ ناک بیٹھی ہوئی دانتوں میں کھڑکیاں ـــــ درمیانہ قد لیکن دوہرا

بدن، رنگ اجلا گندمی، اعصاب بہت مضبوط۔ غموں کی نمائش کرنا ان کی توہین سمجھتے تھے۔ غموں کو دل میں رکھنا ان کی آبرو۔ آنکھوں پر ہر وقت شیشے چڑھے رہتے۔ اکثر سوٹ پہنتے، عید شبرات اچکن اور قراقلی بھی پہن لیتے تھے۔ چال میں فراٹا بالکل نہیں تھا۔ کبھی تیزی سے چلتے تو معلوم ہوتا ٹانگوں میں اکڑ لگی ہوئی ہے — قد سیدھا نہ تھا لیکن اس میں کوئی خم بھی نہیں تھا — دیانتدار پرلے درجہ کے تھے۔ ان کے ہاتھ اور نفس نے کبھی خیانت نہیں کی میں ان کے ساتھ یورپ میں بھی رہا۔ اور جاپان وغیرہ میں بھی۔ ان ملکوں میں لڑکیاں اس قدر ہوتی ہیں کہ بمبئی میں کیلے بھی اس بہتات سے نہیں ہوتے۔ جس کا جی چاہے خفیہ یا اعلانیہ سودا چکا سکتا ہے۔ لیکن ان کی طبیعت ہی ادھر نہ آتی تھی۔ اس لحاظ سے وہ سونا تھے خالص سونا پاسنگ کا سونا۔ کوہ نور ہیرا۔ ممکن ہے ان پر اسلامیہ کالج میں جوانی چنانکہ افتد دانی۔ کے اوقات گزرے ہوں لیکن جس نوجوان عمر اور بے پایاں اقتدار سے وہ اب گزر رہے تھے اُسمیں انہوں نے دماغ کا عیش یک قلم ترک کر رکھا تھا اور لہو ولعب سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ ہم نے ان میں عیب کی جھلک تک نہیں دیکھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گزرگاہِ خیال ہی اس سے خالی ہے۔ حالانکہ ہمارے اکثر دوست رقص و غنا کے بھی شیفتہ تھے۔ اور کوچہ رسوائی کی سیاحت بھی ان کے ذمہ لگی ہوئی تھی۔

اس زمانہ میں ربیعہ سے میری شاعرانہ اٹکھیلیوں کا آغاز تھا۔ ادھر دوستی میں یہ

داستان پھیلتی چلی گئی۔ نظامی صاحب بھی آگاہ تھے۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہتے تھے۔ ان کے رویہ سے ظاہر ہوتا تھا گویا وہ اس سے باخبر ہی نہیں۔ ایک روز موچی والہ جاتے ہوئے (کہ وہاں پولیس نے پورے گاؤں کو مار مار کر اُتو کر دیا تھا اور ان کی عورتوں کو بھی بے آبرو کیا تھا) ——— مجھ سے کہنے لگے:

آغا صاحب! ربیعہ کے معاملہ پر نظر ثانی فرمائیے۔ عام مسلمان ان معاملوں میں زبانیں دراز کر لیتے ہیں۔ شاعری کی اس راہ میں مفت کی رسوائی سے فائدہ؟ ایسا نہ ہو ایک کہانی کئی کہانیوں کا مجموعہ بن جائے۔ آپ ایک نامور مقرر ہیں اس صورت میں لوگوں کی نگاہیں اور بھی کڑی ہوتی ہیں۔ انہوں نے یہ الفاظ اس انداز میں کہے کہ خود بخود دل میں اُترتے گئے۔ نہ وعظ کا رنگ تھا نہ تنبیہہ کی ترشی، نہ نصیحت کا دبدبہ، نہ تہدید کا خوف۔ ان کے اداریوں کی طرح سیدھی سادی بات! میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہا

نظامی صاحب! انشاء اللہ وہی ہوگا جو آپ چاہتے ہیں —'

اس کے بعد نظامی صاحب نے کوئی کلمہ نہ کہا اور بات موچی والا کے حادثہ پر آ گئی۔ اگلے روز اس سانحہ پر نظامی صاحب نے اس جُرأت سے مقالہ لکھا کہ سارا ملک گونج اٹھا۔ انہوں نے خواجہ شہاب الدین کے نام کھلے خط میں وہ تمام واقعات درج کئے جو اس چک کے بدنصیب لوگوں کو پولیس کے ظلم سے پیش آئے تھے۔

اسی روز یا اگلے دن مجھے ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی سرِ راہ مل گئے۔ خشونت آمیز لہجہ میں کہنے لگے:

آپ اور نظامی صاحب پولیس کو پھانسی کیوں نہیں لگوا دیتے۔؟

میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ عرض کیا۔ پھانسی تو قبلہ آپ لگوا سکتے ہیں، ہم تو پھانسی پانے والوں میں سے ہیں۔ تھوڑے دن بعد سی آئی ڈی کے ایک اور افسر مجازسے ہیلیتھ ویز کے باہر تو تکار ہو گئی۔ میں دوائی لے کر باہر آ رہا اور وہ دوائی لینے اندر جا رہا تھا۔ میں نے عادتاً سلام کیا۔ میری عادت ہے کہ میں دو چیزیں ہمیشہ ملحوظ و مقدم رکھتا ہوں ایک سلام میں پہل دوسرا جنازے میں شرکت ــــ افسر مذکور نے اس کو اپنی برتری اور میری کمزوری سمجھا۔ ان کے اور میرے درمیان اس طرح گفتگو ہوئی:

میں "السلام علیکم"

وہ سلام کا جواب دیئے بغیر پنجابی میں "کیا حال ہے تمہارا؟"

مجھے تمکنت ناگوار محسوس ہوئی۔

میں اللہ کا شکر ہے۔ اس کے سہارے جی رہا ہوں۔

وہ تم بہت بڑھ گئے ہو،

میں کیا قصور ہوا ہے جناب؟

وہ ابھی پتہ ہی نہیں کیا خطا ہوئی ہے،

تم لوگ پولیس کے خلاف جہاں تہاں چاہتے ہو محاذ باندھے چلے جاتے ہو'

میَں جناب! میَں نے کہیں محاذ نہیں باندھا.

وُہ موچی والا میں کیا لینے گئے تھے؟

میَں وہ تو حمید نظامی گئے تھے۔

وہ تم بھی تو اس کے ساتھ نتھی ہو کر گئے تھے۔

میں جناب کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ دوست ہیں۔ساتھ لے گئے چلا گیا کوئی گلہ ہے تو ان سے کیجئے۔

وُہ نہیں، تم ٹھیک ہونے کے قابل ہو؛

میں جناب کی مرضی، ہماری خطا؟

وہ تمہیں معلوم ہے، ہم لوگ شمس الحق کی طرح لاشیں بھی گم کرا دیا کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ وہ کھردری پنجابی میں کہہ رہا تھا۔جس سے اس کا لہجہ تلخ ہونے کے علاوہ گنوار بھی ہو گیا تھا۔ میں نے ضبط کو توڑتے ہوئے کہا:

میَں قبلہ! میں تو آپ کو جی جناب کر رہا ہوں لیکن آپ تم ڈھا رہے ہیں۔حتیٰ کہ لاشیں گم کروانے پر آ گئے ہیں۔یہ لہجہ شرفاء کا نہیں ہے اور نہ آپ کو زیب دیتا ہے۔

وُہ تو کیا تمہیں حضور کہا جائے؟

میَں جی نہیں، اِنسان کو شریفانہ طور پر مخاطب کیا جا سکتا ہے۔

وہ پولیس اور شرافت؟ لفنگوں کے ساتھ، ناممکن ہے۔

میَں تو آپ ہمیں لفنگا سمجھتے ہیں،

وہ اس سے بھی بد تر؟

اس کا یہ کہنا تھا کہ میرا پارہ تیز ہوگیا۔ میَں نے اُسی طرح کی ٹھیٹھ پنجابی بولتے ہوئے کہا:

تمہیں غلط فہمی ہے۔

اس نے اپنے فقرے کا اعادہ کرتے ہوئے پھر لاش غائب کر دینے کی دھمکی دی۔ میَں یکسر بے قابو ہوگیا۔ میں نے کہا:

... صاحب! آپ غلطی پر ہیں۔ آپ میری لاش غائب کرا دیں گے۔ میری اولاد، ان سانچوں کو تیزاب سے جلا دے گی جن میں آپ جیسے فرعون ڈھلتے ہیں۔

بس میرا یہ کہنا تھا — کہ افسر مذکور غصہ سے کانپنے لگا۔ اس نے دفتر پہنچ کر بھرپور رپورٹ کی۔ گرمانی صاحب کا زمانہ تھا۔ چھوٹ جھڑ گیا۔ لیکن وہ شخص ہمیشہ میرے تعاقب میں رہا۔ اور جب کوئی بہتری کا موقع آیا اس نے وار پہ وار کیئے۔ اس کے دل و دماغ میں میرے لئے زہر کے سوا کچھ نہیں۔ وہ خود ایک زہر تھا۔ اور زہر نے اس کے رُوئیں رُوئیں کو کژدم و اژدر بنا رکھا تھا۔ نظامی صاحب تک بھی یہ معاملہ پہنچا۔ زانی اور شرابی افسر کے پاؤں نہیں ہوتے۔ نظامی نے جب

اس کی زبانی قصّہ سنا تو اصلیت معلوم کرنے کے لئے مجھے بھی فون کیا۔ مَیں نے من وعن تمام واقعہ بیان کر ڈالا۔ نظامی صاحب نے اس سے کہا:

"آپ شورش سے نمٹ سکتے ہیں، تو ضرور نمٹیں۔ وہ بھی ہٹیا نہیں — اور نہ ہمارا محتاج ہے۔ البتہ آپ اس پر وار کریں گے تو ایک دوست کی حیثیت سے میرا فرض ہوگا کہ اس کا ساتھ دوں۔ شورش پولیس افسروں کے معاملہ میں بڑا فیاض واقع ہُوا ہے۔ البتہ جو اس سے آنکھیں چار کرے اور تہدید آمیز الفاظ سے دھمکانا چاہے وہ جھکتا نہیں۔ آپ نے غلطی کی — اس غلطی کا جواب اس سے مختلف کیا ہو سکتا تھا۔"

اس بزرجمہر کی تلخی اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ میں جن دنوں کامن ویلتھ کانگرس کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے انڈیا جا رہا تھا۔ اس نے بالواسطہ روڑے اٹکائے، مگر صدر ایوب نے اس کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ آخری داؤں اُس نے یہ کھیلا کہ پر بودھ کی بچیوں سے میرے تعلقات کا افسانہ گھڑا۔ جو میری بیٹیوں کی طرح تھیں۔ اور مجھے آج بھی اتنی ہی عزیز ہیں جتنی اپنی بچیاں شائستہ اور شاہدہ —،

صدر نے جب یہ آخری رپورٹ پڑھی تو سخت ناراض ہوئے اور اس کاغذ کو آتشدان میں پھینک دیا کہ یہ سب من گھڑت ہیں۔ حمید نظامی مرحوم نے اس سلسلہ میں صدر کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کیا۔ مسٹر الطاف حسین ایڈیٹر "ڈان" نے صدر سے کہا کہ شورش میرے حلقہ کا آدمی نہیں تاہم میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ساتھ یورپ اور جاپان میں رہا ہے۔ وہ اس مذاق ہی کا نہیں۔ سگرٹ بھی نہیں پیتا۔ میں نے اس کو جنسی لحاظ

سے ہمیشہ ایک شریف انسان پایا ہے۔

اس شکست کے بعد اس کو کلتاش کا منہ کالا ہوگیا۔ لیکن اس کے دل میں جو بغض جڑ پکڑ چکا تھا، وہ اس نے توشۂ آخرت کے طور پر ساتھ رکھا اب اسکا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

دولتانہ وزارت قائم ہوتے ہی "نوائے وقت" اور نظامی پر مصائب کے دروازے کھل گئے۔ سرکاری اشتہارات تو پہلے ہی سے بند تھے۔ ہفتہ عشرہ بعد دولتانہ نے نوائے وقت کا الائنڈ پریس ضبط کرلیا۔ عام پریسوں کو ہدایت کردی کہ نوائے وقت نہ چھاپیں، قانون مطابع میں دفتری ترمیم کی گئی احمد سعید کرمانی نے بعض دوسرے ہم سن ممبروں کو ساتھ ملا کر اسمبلی میں قرارداد پیش کی کہ نوائے وقت پر اسمبلی کے روبرو مقدمہ چلایا جائے۔ تھوڑے دنوں بعد نوائے وقت کا ڈیکلریشن منسوخ ہوگیا۔ میر نور احمد تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر نے کارگزاری کی انتہا کردی۔ "نوائے وقت" کا ڈیکلریشن اٹھا کر ایک اور صحافی کو دے دیا۔ نظامی مرحوم بھی سپر انداز ہونے والے نہیں تھے۔ انہوں نے "جہاد" نکالا۔ حکومت نے اس کو بھی اپنی عیاریوں سے اڑنچھو کرلیا۔ "نوائے پاکستان" نکالا۔ جو "نوائے وقت" کے نکلنے تک چلتا رہا۔ نظامی اور دولتانہ میں کھلم کھلا لڑائی ہوگئی۔ ادھر لیاقت علی خاں کو نظامی نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کی بیگم کے متعلق خامہ فرسائی کرتے رہے حتیٰ کہ ان کے فرکوٹ کا واقعہ بے نقاب کیا۔ ادھر الیکشن

لیاقت علی کے لئے پنجاب کی وسعتیں تنگ کر دیں. حزبِ اختلاف کی ڈٹ کر حمایت کی بغرض نظامی نے یہ لڑائی اس جرأت، مردانگی، دلیری، قوت، شجاعت، ایثار بلند حوصلگی: قربانی، استقلال، استقامت اور ہمت سے لڑی کہ اردو صحافت میں اس کی نظیر نہیں ہے۔ اس آزمائش میں انہوں نے کسی شخص سے ایک کوڑی کی امداد نہیں لی۔ اس اثنا میں ان کے بعض دوستوں نے خوفزدہ ہو کر ان سے ملنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے گلہ تو ایک طرف رہا اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ کئی دفعہ مختلف واسطوں سے کوشش ہوتی رہی کہ دولتانہ اور ان کے مابین مفاہمت ہو جائے۔ دولتانہ نے عاجز آ کر عزیز بیگ کے مکان پر ان سے ملاقات بھی کی۔ لیکن بے سود۔ لیاقت علی خاں کی طرف سے بھی بالواسطہ کوششیں ہوئیں مگر ناکام۔ سردار دیوان سنگھ نے "نوائے وقت" کے مصائب پر بیگم لیاقت علی خاں کو خط لکھا۔ کیونکہ جن دنوں ان کی خان لیاقت علی خاں سے شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ اندر پرست کالج میں پروفیسر تھیں تو دیوان سنگھ مفتون سے ان کے مراسم تھے۔ بیگم نے دیوان سنگھ کو لکھا کہ یہ معاملہ اس طرح طے ہونے کا نہیں۔ نظامی ایک ضدی آدمی ہے"۔۔۔ آخر کامن ویلتھ پریس یونین نے معاملہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو حکومت نے چاروں طرف سے رسوائیاں اور شکستیں سمیٹ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ "نوائے وقت" اسی سج دھج سے نکلا، جو اس کے لئے مخصوص تھی، اور جس کو اس کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

نظامی صاحب قلم کے معاملہ میں کوئی مفاہمت نہیں کرتے تھے۔ قدرت نے انہیں ——— ایک جری دل ایک روشن دماغ ایک شگفتہ روح اور ایک ناقابل تسخیر ولولہ دیا تھا۔ انہوں نے "نوائے وقت" کو اپنے زورِ قلم یا زورِ ذہانت سے ایک تحریک ایک انجمن ایک ادارہ ایک تنظیم ایک جدوجہد اور ایک صمصام بنا دیا تھا۔ وہ پہاڑوں کی طرح مستقل مزاج اور آبشاروں کی طرح رواں دواں تھے۔ ان کی خرابی کہہ لیجئے یا خوبی، اَنا کہہ لیجئے یا غرور۔ وہ اکثر وزیروں کو زچ کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ صوبائی وزیروں میں سے تو اکثر کو منہ ہی نہیں لگاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس مخلوق میں کم لوگ قابلِ ذکر ہوتے ہیں۔ مرکزی وزراء میں بھی دو چار کے قدردان تھے باقی سب کو پستہ قامت خیال کرتے۔ کئی وزیروں کو جان بوجھ کر اپنے دروازے پر بیٹھائے رکھتے، اکثر وزراء کو ملاقات کا وقت نہ دیتے۔ بسا اوقات وزرائے اعظم کو انکار کر دیتے کہ میں اس وقت معمول کے مطابق اپنے دوستوں کے ساتھ گپ لگا رہا ہوں۔ اکثر بڑے بڑوں سے ہاتھ ملانے سے بھی انکاری ہو جاتے۔ ان کے نزدیک دوست کشی سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں تھا۔ وہ غداری کے بعد سب سے زیادہ خطرناک اسی جرم کو خیال کرتے تھے۔ جس دوست کے بارے میں انہیں یہ معلوم ہو کہ دوستوں کا مخلص نہیں یا کسی وقت اُس نے اپنے احباب سے دغا کی تھی اس سے اول تو فوراً ہی ورنہ بتدریج تعلقات منقطع کر لیتے۔ وہ چھچھلے لوگوں سے تعلقات بنانا انسانی شرف و مجد کی اہانت

سمجھتے تھے۔ ان کا نطشے کے الفاظ میں عقیدہ تھا کہ پستیوں سے کہیں خطرناک بلندیاں ہوتی ہیں کیونکہ انہیں برتری کے احساس نے اندھا کردیا ہوتا ہے۔

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو، اس کے برعکس بہ تصرف ادنیٰ یہ کہئے کہ حسنِ او خوب بگفتی عیب او نیز بگو۔ وہ بہرحال ایک انسان تھے۔ اور انسان معصوم عن الخطا نہیں ہوتا۔ اس میں کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اس سے غلطیاں بھی اُچھلتی ہیں۔ انسان کبھی کامل نہیں ہوسکتا۔ بے عیب صرف اللہ کی ذات ہے۔ یا پھر پیغمبروں کا وجود خطاؤں سے منزہ ہوتا ہے۔ نظامی میں بھی بعض کوتاہیاں تھیں لیکن یہ کوتاہیاں ان کے دماغی فیصلوں کی کوتاہیاں تھیں۔ فی نفسہٖ ان کا دل ایک مسلمان کا دل تھا ؎

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق

ماہنامہ "نقوش" کے "شخصیات نمبر میں" میں نے ان کی سیرت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ پنجاب کے بڑے بڑے خاندانوں کی دولت اور رعونت کے خلاف پنجاب کے پسماندہ خاندانوں کی عسرت اور غربت کا ذہنی انتقام تھے ——— انہیں ان خاندانوں کے فرزندوں کو نقد و نظر کی سنگینوں کے حوالے کرکے بطف محسوس ہوتا تھا۔ وہ صرف شرافت کی قدر کرتے تھے۔ کسی آدمی کی اس کی دولت کی بنا پر مطلق عزت نہیں کرتے تھے۔ بہ قول ظفر علی خاں

اُن کا عقیدہ تھا کہ ؎

اس ابتلائے خدا کی ہزار بار پناہ
کہ جھک کے تم کسی نا اہل کو سلام کرو

یہی وجہ تھی کہ بعض لوگ بلکہ اکثر لوگ جو ان کے نزدیک نہیں تھے انہیں بد دماغ کہتے۔ کسی حد تک یہ درست بھی تھا۔ وہ اپنے دائرے میں قائدِ اعظم کی مثل تھے۔ ناقابل خرید، ناقابل تسخیر، ناقابلِ مفاہمت، ضدّی، مستقل مزاج، دیانت دار، فہمیدہ، بات کی تہ تک پہنچ جانے والے۔ جو سامنے آیا پٹ گیا۔ ان میں ایک خوبی وافر تھی کہ وہ مار کھانا بھی جانتے تھے صرف مارتے نہیں تھے۔ ان کا دل بھی سخت تھا۔ جو رائے ایک دفعہ قائم کر لیتے جب تک اس سے بہتر رائے سامنے نہ آتی محض دوستانہ بنیاد پر ترک نہ کرتے۔ قلم کے معاملہ میں دوستوں کی رائے بھی نہ مانتے تھے۔ بعض لوگوں کا عطر نکال رکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں دوستانہ تبصرہ کر جاتے۔ اپنے معاملات میں دوستوں کو بھی مشیر نہ بناتے۔ خود ہی سوچ ساچ کر کسی فیصلہ پر پہنچ جاتے۔ ان کا معاملہ ہندسوں کی طرح تھا۔ ذاتی دکھ درد میں کسی کو شامل نہ کرتے۔ ہر مسئلہ خود ہی حل کرتے۔ راز داری ان کی طبیعت کا جزوِ غیر منفک تھا۔ ہر دوست کو ہر بات کا اہل نہ سمجھتے، لیکن ہر دوست سے توقع رکھتے تھے کہ ان کے فیصلوں پر صاد کرے۔ زندگی لگی بندھی تھی۔ منہ اندھیرے اُٹھتے۔ پانی گرم کرتے خود ہی چائے بناتے۔ منہ ہاتھ دھو کر چائے پیتے

فجر کی نماز ضرور پڑھتے۔ اتنے میں اخبار آجاتے ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر اخبار کا کام کرتے۔ صبح دس بجے تک اسی میں لگے رہتے۔ مکان سے باہر تختی لگا رکھی تھی کہ ملاقاتی حضرات گیارہ بجے کے بعد تشریف لائیں یہ کام کا وقت ہے۔ فون خود ہی سنتے بارہ بجے میاں محمد امین کے ہاں جاتے۔ وہاں گپ اور چائے چلتی۔ ایک بجے واپسی ہوتی۔ کھانا کھاتے کچھ دیر آرام کرتے، سو کر اٹھتے، نہاتے دھوتے، کپڑے بدل کر دوستوں کی محفل میں مقررہ ریستوران میں چلے آتے۔ وہاں مغرب تک بیٹھتے۔ پھر سیر کرتے، عشاء سے پہلے گھر پہنچ جاتے۔ رات کا کھانا عموماً ترک کر رکھا تھا۔ کہیں دعوت ہوتی تو تھوڑا سا کھا پی کے چلے آتے۔ رات دیر تک پڑھتے۔ پڑھتے ہر چیز تھے۔ انگریزی کی نئی تاریخی اور سیاسی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ جواب ہر خط کا دیتے اور اپنے قلم سے دیتے۔ سوادِ خط انتہائی بھدا تھا لیکن جواب نہایت معقول اور مختصر ہوتا۔ غالبؔ کا سا اندازِ بیاں تھا۔ کھانے میں صرف کباب یا تکّے مرغوب تھے۔ زمانہ طالب علمی کے استادوں کی بے حد عزت کرتے اور ان کے کام آتے تھے۔

قائدِ اعظمؒ کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے۔ انہیں اپنا لیڈر اور محسن سمجھتے باقی لیڈروں کو برابر سر ابر کا سمجھتے بعض کی عزّت رسماً کرتے ورنہ انہیں سیاسی المیہ کے اداکار گردانتے۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے آخر وقت تک مخالف رہے۔ لیکن لیگ کی لیڈرشپ کے متعلق بھی ان کا حسنِ ظن ٹوٹ چکا تھا اور ان سے سخت بیزار تھے۔ یہی صدمہ

انہیں مارشل لا دیمک کی طرح کھاتا رہا۔ اور وہ خزاں کے پتوں کی طرح اندر ہی اندر جھڑتے گئے۔ انہیں اس بات کا سخت رنج تھا کہ لیگ کی لیڈرشپ نے اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے۔ ان میں کوئی جاندار آدمی نہیں ہے ورنہ مارشل لا، اس طرح نہ لگتا۔ اور نہ یہ رات طویل ہو کر اتنی لمبی ہوتی کہ لوگ سحر کو ترس گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے طور پر کئی دفعہ مختلف لیڈروں کو انگیخت کیا اور کچھ کر گزرنے کی تحریک بھی کی لیکن ان کی بزدلی سے مایوس ہو گئے۔ انہیں سب سے زیادہ صدمہ یہ تھا کہ قوم میں زندگی اور اس کی روح نہیں رہی۔ لوگوں کا اپنے آپ سے اعتماد اٹھ گیا اور بزدل ہو گئے ہیں۔ عوام نے خود سپردگی کا انداز اختیار کر لیا ہے۔ اگر لیل و نہار اسی طرح رہے، تو صورتِ حال یہ ہو گی کہ ہم لوگ ایک سیاسی قبرستان میں زندگی گزار رہے ہونگے۔ جہاں گورکن اور مجاور موجودہ حکمران ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ "نوائے وقت" نے اردو اخبار نویسی میں انقلاب پیدا کیا۔ سرسری طور پر اس کا جائزہ اس طرح لیا جا سکتا ہے۔

۱۔ "نوائے وقت" سے پہلے صحافت کے مزاج میں انشاء پردازی اور شعر و شاعری کا دخل تھا۔ عام اخباروں کے مالک و مدیر عموماً ادیب و شاعر ہوتے تھے "نوائے وقت" نے اخبار نویسی کی ان روایتوں کو بدلا۔ انہیں مغربی مذاق صحافت سے آشنا کیا۔ مثلاً:

۱ ۔ اداریہ نویسی کو مختصر، جامع، برمحل، تخلیقی اور موضوع کے اردگرد کیا۔

ب ۔ خبروں کی ترتیب میں انگریزی اخباروں کی وسعت تو نہیں شباہت پیدا کی۔

ج ۔ عام لوگوں کی بدلے ہوئے زمانہ کے مطابق ذہنی آبیاری کی۔

د ۔ قصیدوں سے احتراز کیا

ر ۔ ذاتی پراپاگنڈے سے اجتناب برتا۔ مثلاً زمیندار میں ایک دفعہ مولانا اختر علی خاں نے عیدالاضحیٰ پر قربانی کے دُنبے کی تصویر شائع کی تھی لیکن نظامی نے اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی خبر بھی نہ دی۔ ان کا ذہن تھا کہ اخبارات ذاتی پراپاگنڈے کے لئے نہیں بلکہ قومی معاملات کی اشاعت و ترویج کے لئے ہوتے ہیں۔

۲ ۔ اُردو اخبار نویسی کو انگریزی اخباروں کی طرح باوقار کیا، اور بلند سطح پر لے گئے۔ بلکہ اداریوں کے اعتبار سے اور بھی بالا کیا۔

۳ ۔ ایڈیٹر کو سیاسی اشغال سے الگ رکھنے کی نیو رکھی۔

۴ ۔ پاکستان کی حکومتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا اس لحاظ سے وہ خود ایک تاریخ تھے۔

۵ ۔ اعلیٰ طبقے کو اُردو اخبار پڑھنے کی عادت ڈالی۔

۶ ۔ حکومت کے ایوانوں تک "نوائے وقت" کو اس کی قدر و منزلت کے اعتبار سے پہنچایا۔

۷۔ اپنی تحریروں سے حکومت میں خوف، دوستوں میں ستائش اور لوگوں میں "پرستش" پیدا کی۔

۸۔ اخبار کے تجارتی پہلوؤں کو ملحوظ رکھا۔

۹۔ چندہ بازی اور امداد و اعانت کے عوامی و سرکاری طریقوں کو ختم کیا۔

۱۰۔ اخبار کو یلو جرنلزم (YELLOW JOURNALISM) سے دور رکھا۔

۱۱۔ قلم اور صحافت کی آبرو میں حیرت انگیز اضافہ کیا۔

۱۲۔ ثقیل الفاظ کی جگہ سہل الفاظ کو رواج دیا۔

۱۳۔ شروع سے آخر تک اپوزیشن کے ذہن و تصور کی حمایت کی۔

۱۴۔ پریس کی بین الاقوامی تنظیموں میں اردو اخبار نویسی کی جگہ پیدا کی اور اپنا سکّہ بٹھایا۔

"رپورٹر" کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر کلال نے دہلی میں خود راقم الحروف سے کہا تھا کہ تمہارے ہاں حکومت صرف ایک ایڈیٹر سے ڈرتی اور گھبراتی ہے اور وہ ہیں "نوائے وقت" کے مسٹر حمید نظامی، باقی اس کے دل میں کسی کے لئے کوئی خاص جگہ نہیں۔ حمید نظامی کے متعلق صدر مملکت کا خیال ہے کہ وہ بڑا ہوشیار ایڈیٹر ہے۔ جو ان کی حکومت کے خلاف لوگوں کے دماغوں میں ہلکا ہلکا زہر داخل کرتا رہتا ہے۔ مسٹر کلال کا یہ بھی خیال تھا کہ حکومت عنقریب "نوائے وقت" کی اشاعت ممنوع کرنے والی ہے۔ اس کے نزدیک نوائے وقت ملک میں پرائی جمہوریت کا

تذکرہ کرکے ان کے نو ایجاد نظام بنیادی جمہوریت کے سینہ میں خنجر بھونکتا ہے۔

مسٹر کلال نے حمید نظامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

اس کوتاہ قامت آدمی میں جانے کیا خوف بھرا ہوا ہے کہ حکومتِ پاکستان کے اعیان و انصار بھی اس سے خوف زدہ ہیں۔ وہ اس کو ہر قیمت پر رام کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کا پختہ خیال ہے کہ یہ کسی طرح رام نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ نوائے وقت کی اشاعت روک دی جائے اور اس شخص کو بے بس کر کے جیل میں ڈال دیا جائے۔ یا پھر اس کی موت واقع ہو جائے۔ اس صورت میں نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔

نظامی مرحوم بھی چٹکی لینے سے کب رکتے تھے۔ انہوں نے مارشل لا میں بھی کلمۃ الحق بلند کئے رکھا۔ اور اس طرح پہلو دار تنقید کرتے رہے کہ حکومت منہ تکتی رہ جاتی۔ ان کا ایک ہی موقف تھا۔ کہ مارشل لا ختم کیا جائے۔ اور لوگوں کو بالغ رائے دہی کے اصول پر ووٹ دینے کی اجازت ہو۔ تاکہ وہ اپنے نمائندے منتخب کریں۔ جو ان کے اعتماد سے ان پہ حکومت کریں۔ جمہوریت اسی کا نام ہے۔ عوام کی حکومت عوام کے ووٹوں سے عوام کی معرفت عوام کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ انہوں نے صدرِ مملکت کی خواہش پر ان سے کئی دفعہ ملاقات کی۔ لیکن دوسرے ایڈیٹروں کی طرح انہوں نے خوشامد نہیں کی بلکہ کلمۃ الحق کہا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ مارشل لا کو جو کام کرنا تھا وہ ہو چکا۔ اب اس کو ختم کیجیے۔ اور لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق لوٹائیے۔

ایک دفعہ انہوں نے صدر سے کہا۔ اس قسم کی گھٹن سے نراج کو راستہ ملتا ہے۔ آمریت کے لئے سب سے بڑی مشکل اس کی جانشینی ہوتی ہے ؟ اگر ایک آمر بالفرض اچھا بھی ہو تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس کا جانشین بھی اچھا ہوگا۔ یہ زمانہ آمروں یا بادشاہوں کا نہیں۔ یہ جمہور کا زمانہ ہے اور جمہور کو زیادہ دیر تک پا بہ زنجیر نہیں رکھا جا سکتا ہے۔

نظامی صاحب نے انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کے دو سالانہ اجلاسوں برلن اور ٹوکیو میں بھی دنیا بھر کے اخبار نویسوں کو یہی تاثر دیا کہ پاکستان اول و آخر جمہوریت چاہتا ہے۔ یہی بات انہوں نے کامن ویلتھ پریس کانفرنس کے مندوبین سے کہی۔ لیکن ان کا ایک جذبہ بڑا ہی قابلِ تکریم تھا۔ کہ وہ اپنے ملک سے باہر اپنی حکومت، اپنی قوم، اپنی مملکت اور اپنے ملک کی توہین گوارا نہیں کرتے تھے کوئی سوال کرتا تو اس کو ٹکا سا جواب دیتے کہ یہ ہمارا گھریلو مسئلہ ہے۔ ہم بیرونی مداخلت نہیں چاہتے۔ ان ملکوں میں ان کے اشغال کانفرنس کی کارروائیوں کے بعد سیر و سیاحت اور نائٹ کلبوں میں رقص دیکھنے تک محدود ہوتے تھے۔ جہاں تک عزت نفس کا سوال تھا وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرتے جس سے ان کی ذات پر آنچ آتی ہو۔ یا ملک رسوا ہو۔ انہیں نہ تو کوئی نشہ تھا نہ کوئی عیب۔ بس رقص دیکھنے کے شوقین ضرور تھے۔ یا پھر دوستوں کو چھیڑ کر کیف و سرور اٹھاتے تھے۔ اُن کے احترام کا یہ حال تھا کہ ہر ملک کا ایڈیٹر ان کی عزّت کرتا۔ ان کے خیالات غور

سے سنتا اور ان کے صائب الرائے ہونے کی داد دیتا۔ میں نے اپنے ساتھی ایڈیٹروں میں کسی شخص کی اتنی اہمیت اور عزت نہیں دیکھی جتنی حمید نظامی کو اردو اخبار نویس ہونے کے باوجود بین الاقوامی طور پر حاصل تھی۔

ان ساری خوبیوں کے باوجود ایک خلا ہمیشہ ہی محسوس کیا گیا، کہ

۱۔ نوائے وقت نے متبادل لیڈر شپ نہ پیدا کی۔

۲۔ جن لوگوں کو وہ پرکھ چکے تھے انہیں بار بار آزماتے رہے یا انہی کے بتوں کو اٹھاتے چلے گئے۔

۳۔ ان سے معافی پا کر قاتل بھی مقتول ہو جاتا تھا۔

۴۔ انہوں نے لیگ سے شدید اختلاف کے باوصف پرانے اور سیانے مسلم لیگیوں ہی کو مقدم رکھا۔ جن کا طول اس زمانے میں خان عبدالقیوم اور عوض احمد سعید کرمانی تھے۔

۵۔ وہ بسا اوقات ساتھیوں کے انتخاب میں بھی غلطی کر جاتے تھے۔

۶۔ ان کا اختلاف بہت شدید ہوتا تھا۔

۷۔ وہ ان لوگوں کی بھی سرپرستی کر جاتے تھے جن کے متعلق انہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی بدولت ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

۸۔ جن لوگوں سے اختلاف ہوتا ان کے لئے ان میں عفو و درگزر کا مادہ بالکل نہیں تھا۔

۹۔ وہ سیاسی کام کرنے کے بڑے متمنی تھے لیکن ایک جماعت کیونکر فراہم ہو سکتی ہے خود اس کے لئے اقدام نہیں کرتے تھے۔

۱۰۔ انہیں اپنی رائے پر اتنا اعتماد ہوتا کہ اس کے منوانے پر مُصر ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دوستوں کے غور و فکر کا راستہ رک جاتا تھا۔

۱۱۔ وہ تنہا فیصلہ کرتے اور دوستوں سے توقع کرتے کہ بلا چون و چرا تسلیم کرلیں گے۔ چونکہ ان سیاسی فیصلوں میں ان کی اپنی ذات کا سوال نہیں ہوتا تھا اس لئے اکثر و بیشتر دوست ان کی فراست اور ان کے اخلاص کو ملحوظ رکھتے ہوئے صاد کر دیتے تھے۔ لیکن اس کا نتیجہ وہی نکلا جو ناگزیر تھا۔ یعنی وہ رحلت کر گئے تو ان کا مرکزی وجود بھی ختم ہو گیا۔ بہ الفاظ شاعر ؎

وہ اُٹھ گئے تو چراغوں میں روشنی نہ رہی

مارشل لاء کے نفاذ نے ان میں گھٹن پیدا کر دی تھی. وہ چاہتے تھے کہ یہ بلائے بے درماں جلد سے جلد ختم ہو اور ملک و ملت کے جن مسائل میں تشنگی محسوس ہو رہی ہے ان کے بارے میں حکومت کو جھنجوڑیں. لیکن مارشل لاء زلفِ یار کی طرح دراز ہوتا گیا. اس کی تھاہ کا پتہ ہی نہ چلتا تھا. مارشل لاء ایک اژدہا کی طرح پھنکارتا رہا. وہ اس کے خوشگوار پہلوؤں کے بھی معترِف تھے. لیکن اصولاً اور معناً اس کے خلاف تھے. فی الجملہ وہ مارشل لاء کو ملک و قوم کی ذہنی آب و ہوا کے منافی سمجھتے تھے. یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کے پاس بھی قسم کے لوگ چلے آتے تھے. خصوصیت سے وہ لوگ جو محرومِ اقتدار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے وہ انہیں جگانے اور اٹھانے کی بہت کوشش کرتے. لیکن بے سُود. خان عبدالقیوم کے معافی نامہ نے انہیں دِل شکستہ کر دیا تھا.

میں انہیں چھیڑا کرتا کہ آپ مسلم لیگ سے اس کے سوا کیا توقع کر سکتے ہیں؟

تو انہیں احساس و اعتراف کے باوجود جھنجلاہٹ ہوتی. وہ تبّرا تولتے کہ پاکستانی قوم کو گوؤں کی سیادت سے واسطہ پڑا ہے. ان کے نزدیک لیگ متروکاتِ سخن میں سے تھی. اس کے بعض الفاظ اور نعرے غیر مستعمل ہو گئے تھے. وہ چاہتے تھے کہ گریبانوں پر ہاتھ ڈالیں لیکن موسم کے انتظار میں تھے. انہوں نے میاں افتخارالدین سے بھی صلح کر لی، عوام کے متعلق ان کا خیال تھا ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اس کے باوجود انکے نزدیک ساری قوم اقبالی مجرم ہو گئی تھی. جس روز ان پر موت کے مرض نے حملہ کیا اس رات وہ خلاف معمول کچھ زیادہ ہی غمگین تھے. گارڈینیا سے نکل کر موٹر میں سیر کی. پھر ٹمپل روڈ کے چوک میں اتر گئے. اور مجھے ساتھ لے کر ٹمپل روڈ سے ہائی کورٹ تک ٹہلنے لگے. یہ ان کے معمول کے خلاف تھا. فرمایا:

میرا بچّہ کہتا تھا کہ اخبار نویسوں کو کیا ہو گیا ہے. ان کے قلم گنگ ہو گئے ہیں؟ جب اولاد اس طرح سوچے اور باپ کی عزت بیٹے کی نظر میں حقیر ہو جائے تو زندگی بدمزہ ہو جاتی ہے. میں آج اس کو جواب دیئے بغیر چلا آیا ہوں.

ن. اِس سنّاٹے کا جواب کیا ہو سکتا ہے.

ش. لیکن اب تو یہ سناٹا ٹوٹنے والا ہے.

ن. یہ سناٹا ہمتِ مردانہ کے بغیر کبھی نہیں ٹوٹے گا.

ش. کچھ فرق تو پڑے گا.

ن۔ صرف زنجیریں بدلی جا رہی ہیں۔ - - - - - - ان سے قیدی آزاد نہیں ہو جائیں گے۔

ش۔ لیکن مارشل لار کا خوف تو نہیں رہے گا۔

ن۔ ٹھیک یہی وقت گریبانوں پر ہاتھ ڈالنے کا ہے۔

ش۔ ہاتھ کون ڈالے؟ چاروں طرف خلا ہی خلا ہے۔

ن۔ اس خلا کو دور کیا جا سکتا ہے۔

ش۔ کون کر سکتا ہے۔

ن۔ میں اور آپ۔

ش۔ نظامی صاحب مجھ میں ہمت نہیں کثیر العیال ہوں۔ کوئی بازو نہیں حکومت پرائی نہیں اپنی ہے۔ اس نے ایک دفعہ دھر لیا تو پھر جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔

ن۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، تم بھی کمزوروں کی سی بات کرتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں بھی جیل جاؤں گا۔

ش۔ نتیجہ کیا ہوگا ؟ ،

ن۔ صرف بند ٹوٹنے کی دیر ہے انشاء اللہ نتیجہ اچھا نکلے گا۔

ش۔ لیکن خان عبدالقیوم کی گرفتاری کے وقت تو یہ بند نہیں ٹوٹا تھا۔

ن۔ اب حالات مختلف ہو چکے ہیں۔ لوہا گرم ہے صرف چوٹ لگانے کی

ضرورت ہے۔

ش۔ آپ کا خیال ہے۔

ہم نے ٹمپل روڈ سے ہائی کورٹ تک فٹ پاتھ پر کئی پھیرے کئے لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ نظامی صاحب سے میرا اختلاف قائم رہا۔ مجھے ان کی کوئی دلیل واپیل اور دعوت وترغیب آمادہ نہ کرسکی۔ وہ سخت مایوس ہوگئے۔ تاہم انہوں نے دل نہیں چھوڑا۔ ان کا خیال تھا میں جذباتی آدمی ہوں آج نہیں کل مان جاؤں گا۔ وہ مجھے ازراہِ مذاق طعن بھی دیتے رہے کہ مال اور اولاد کے اڑکاؤ کی وجہ سے بزدل ہوگئے ہو۔ لیکن میں زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد' ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کا اصرار بڑھتا ہی جارہا ہے اور وہ کچھ افسردہ سے ہوگئے ہیں۔ چنانچہ جب ان کی زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ میں اِس سڑک پر پھرتا ہوا اپنے آپ کو بے غیرت محسوس کر رہا ہوں۔ مجھ پر بجلی کے اِن کھمبوں سے لے کر ہائیکورٹ کی بُرجیاں تک ہنستی نظر آتی ہیں، تو میں نے ان سے (روزوں کے دن تھے) سحری کے وقت حاضر ہوکر مزید بات چیت کرنے کا وعدہ کیا۔ گھر پہنچ کر میں بھی بے چین رہا اور شاید وہ بھی سو نہ سکے۔ سحری کے وقت فون کی گھنٹی بجی

" آغا صاحب تشریف لایئے "

" سحری تیار ہو رہی ہے۔ کھا کے حاضر ہوتا ہوں۔"

" یہاں کھا لو "

"جی نہیں ہم لوگ کشمیری ہیں۔ ہمارا کھانا پینا ذرا پر تکلف ہوتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد پھر فون آیا۔ "ابھی تک آپ گھر میں ہیں چلے نہیں"

"بس! روٹی سامنے رکھی ہے دو چار نوالے حلق سے اتار کر آتا ہوں"

آدھ گھنٹہ اسی میں لگ گیا۔ میں نے فون کیا تو رسیور ایک مانوس آواز نے اٹھایا۔ ڈاکٹر شبر حسن بول رہے تھے۔

"نظامی صاحب کہاں ہیں"

"انہیں تکلیف ہو گئی ہے"

"بھئی ابھی تو انہوں نے مجھے دو دفعہ فون کیا ہے کہ فوراً چلے آؤ کچھ باتیں کرنی ہیں۔ وہ رات وعدہ لے کر گئے تھے۔"

"انہیں ابھی تکلیف ہوئی ہے۔ بھابی نے فون کر کے بلایا ہے میں نے انجکشن دے دیا ہے تمہارے آنے کی ضرورت نہیں وہ سو گئے ہیں۔"

میں نے سمجھا جان بچی لاکھوں پائے۔ صبح ہو گئی میں گھر سے کسی کام کے لئے نکل گیا۔ کوئی نو بجے کے لگ بھگ دفتر پہنچا تو محمد حسین نے بتایا کہ میاں محمد امین اور راجہ حسن اختر کے بہت سے فون آ چکے ہیں۔ نظامی صاحب کو ہارٹ اٹیک (HEART ATTACK) ہو گیا ہے۔ ان کی حالت نازک ہے۔

میں بھاگم بھاگ ان کے ہاں پہنچا تو وہ بے ہوش پڑے تھے۔ میاں محمد امین نے کہا کہ ڈاکٹر شجاعت علی جواب دے گئے ہیں۔ ڈاکٹر شبر نے کہا۔ جس ڈاکٹر

کو چاہو بلا لو۔ لیکن اب ان کا بچنا محال ہے۔

الہٰ العالمین! یہ کیا ؟ جب یقین ہی ہو گیا کہ ان کا چراغِ حیات گُل ہو رہا ہے تو میں نے ڈاکٹر مبشر حسن سے صلاح کر کے مجید نظامی کو لندن فون کیا۔ بڑی کشمکش کے بعد فون ملا۔ میں اور دوسرے خاص دوست سمجھتے تھے کہ مجید کا لاہور پہنچنا ضروری ہے۔ بھائی تو یوں بھی ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن مجید تو حمید کے لئے گوہرِ یک دانہ تھا۔ انہیں اپنے بھائیوں میں مجید سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے نہ صرف مجید کی تعلیم کو مکمل کرایا بلکہ بیرسٹری کرنے کیلئے لندن بھجوا دیا۔ جہاں وہ "نوائے وقت" کے وقائع نگار خصوصی تھے۔ ایک صحافی کے طور پر مجید کی تربیت کی۔ جب مجید لاہور میں تھے تو "سرِ راہے" کا کالم عموماً وہی لکھا کرتے۔ مجید کے نقطۂ نگاہ میں تنوع پیدا کرنے کے لئے انہیں دنیا کے مختلف ملکوں میں بھجوایا۔ تاکہ وہ خود دیکھ اور پرکھ لیں کہ دنیا کے حالات کن سانچوں میں ڈھل رہے ہیں۔ موت سے کوئی سال پہلے انہیں نوائے وقت پبلی کیشنز کا ڈائریکٹر منتخب کرایا۔ گویا ایک غائبانہ تصور ان کے لاشعور میں کام کر رہا تھا کہ وہ رختِ سفر باندھ کر ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے جا رہے ہیں۔ مجید کی شادی بھی نہایت شفقت سے کرائی۔ مجید لندن میں تھے کہ فون کے ذریعے ایجاب و قبول ہوا ـــــ اگلے روز ریحانہ (مجید کی اہلیہ) کو انگلینڈ بھجوا دیا۔ دو تین سال سے وہیں رہ رہے تھے۔ ہم نے لاہور سے فون کیا تو مجید گھر پر نہیں تھے۔ ریحانہ

نے فون سُنا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ حمید نظامی جاں بلب ہیں، مجید فوراً لاہور چلے آئیں، تو وہ نالہ بلب ہو گئیں۔ مجید اسی روز دم بخود لاہور آگئے۔ مجید کے آتے ہی حمید نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ بھائی کو دیکھا تو قدرے تبسّم فرمایا :

" مجید ! تم آگئے ؟ " " تمہیں کس نے اطلاع دی۔ ؟ "

پہلا جملہ تو ان کے ہونٹوں سے ٹوٹ کر نکلا۔ لیکن دوسرا ان کے چہرے کا تاثر تھا۔ اس کے فوراً بعد آنکھیں بند کر لیں۔ اور پہلے کی طرح بے ہوش ہو گئے۔ پھر ایک رات اور ایک دن بے ہوش رہے۔ تین شب و روز موت سے جنگ کی آخر ۲۵ رفروری ۱۹۶۲ء کو ان کا کاسۂ حیات پُر ہو گیا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی بھی لوٹ کر نہیں آتا۔

غالبؔ نے کہا تو اپنے متعلق تھا لیکن اِن کی سیرت پر بھی بکمال و تمام کھلتا ہے کہ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اختتامیہ

یہ اوراق جو آپ کی نگاہ سے نکلے ہیں آپ نے محسوس کیا ہوگا کوئی باقاعدہ سوانح عمری نہیں کسی مبسوط کتاب کا حصّہ نہیں، اس پر کسی تذکرہ کا اطلاق نہیں ہوتا نہ ہم اسے کہانی کہہ سکتے ہیں اور نہ اس میں افسانوی خوبو پائی جاتی ہے۔ اس میں ایک ایسی داستان کی آمیزش ضرور ہے جو ہمارے سامنے رونما ہوئی پھر ایکا ایکی ختم ہوگئی۔ یہ ایک تجزیہ ہے ایک مشاہدہ ہے ایک مطالعہ ہے اس شخص کے بارے میں جو ہمارے سامنے زندگی کے سفر کو نکلا تھا۔ دنوں ہی میں نمایاں و ممتاز ہوگیا حتیٰ کہ اس کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ شہروں میں اس کی باتیں تحریک بن کر پھیلتی رہیں، محلوں میں اس کا خوف مسلّط ہوتا گیا، میدانوں میں اس کا چرچا رہا دفتروں میں اس کا ڈنکا بجا۔ شہریاروں نے اس کی چوٹیں سہیں

وزارتوں کو ہدف بننا پڑا۔ حکومتوں نے رختِ سفر باندھا اور غزلہ ہوگئیں۔ دوست اس سے پھول چنتے اور دشمن زخم کھاتے رہے۔ اپنے ہمعصروں میں وہ سب سے کم عمر تھا، لیکن سب سے آگے نکل گیا۔ اچانک سناؤنی آگئی اور وہ واصل بحق ہوگیا۔

ایک مصنّف یا مؤلف کے لئے یہ کہنا مشکل ہوتا تھا کہ جو تصویر اس نے بنائی ہے وہ کہاں تک حسب حال ہے ـــــ ہو بہو عکس ہے یا اس کے خط و خال بنانے میں کوئی نقص رہ گیا ہے۔ کسی خط میں کوئی ٹیڑھ تو نہیں؟ کوئی رنگ تو پھیکا نہیں ہوگیا۔ یا کہیں نوک پلک میں کمزوری آگئی ہو وغیرہ۔

میرا خیال ہے میں نے جس طرح نظامی مرحوم کو دیکھا اور جس کینڈے کا انسان پایا پچھلے اوراق میں اس کی صحیح صحیح تصویر پیش کر دی ہے۔ رہا یہ سوال کہ مجھ سے تصویر بنانے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو جس شخص نے تصویر بنائی ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ جس رُخ سے یہ تصویر تیار ہوئی ہے وہ مکمل ہے اس کے لئے تصویر میں حسن ہی ہو سکتا ہے عیب نہیں۔

دنیا میں سب سے مشکل فن انسان کا مطالعہ ہے۔ خود انسان اپنے بارے میں تیقن سے نہیں کہہ سکتا کہ اپنے افکار و سوانح کے بارے میں جو کچھ پیش کر رہا ہے، وہ کہاں تک صحیح ہے۔ دوسرے کے متعلق تجزیئے، مطالعے اور مشاہدے کا دعویٰ کرنا اور بھی مشکل ہے۔ بہرحال ایک دیانت دار مصنّف کا فرض یہی ہے کہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اسی طرح بیان کرے۔ اگر وہ اپنی طرف سے اس میں

ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کرتا ہے تو یہ فی الجملہ زبان و بیان کی نامرادی ہے۔ ممکن ہے کسی واقعہ کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو۔ لیکن میں نے جو کچھ لکھا، پوری ذمہ داری سے لکھا اور روایت کی ترازو میں تول کر لکھا ہے۔

نظامیؒ کی رحلت کے بعد میں نے ان کے متعلق بہت سے مضمون لکھے ہیں۔ اِن اوراق کے ساتھ ان کا تعلق نہیں۔ لیکن جب ایک ہی کہانی اور ایک ہی واقعہ الفاظ کے مختلف سانچوں میں ڈھلا ہو تو اس کے رنگ و روغن میں ضرور تھوڑا بہت فرق آجاتا ہے۔ یہ چیز ہر مصنف کے ہاں پائی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک روحِ معانی اور نفسِ واقعہ کا تعلق ہے وہ کبھی مجروح نہیں ہوتے اور نہ ان میں کوئی فرق آتا ہے۔ میں نے پوری ذمہ داری سے قلم اٹھایا ہے۔ البتہ ایک بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ میں نے یہ اوراق اپنی نظر بندی کے دوران قلم برداشتہ لکھے ہیں حکومت نے مجھے ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء کو لاہور سے گرفتار کیا اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۳۲ کے تحت چھ ماہ کے لئے ساہیوال سنٹرل جیل میں مقید کر دیا۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ جن تحریروں کی پاداش میں مجھے قید کیا گیا ان کا حدود اربعہ کیا ہے لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ بے گناہ پکڑا گیا ہوں اختیار کی جبینوں پر شکن آگئی ہے۔

نہ جانے شعر زیب النساء کا ہے یا شبلی کی تحقیق کے مطابق اس سے منسوب ہو گیا ہے۔ بہر حال اس دفعہ اس کا لطف بارہا کے لطف سے کہیں زیادہ دلفریب

تھا ؎

اے عندلیبِ ناداں دم در گلو بہ بند
نازک مزاج شاہاں تابِ سخن نہ دارد

اِس نازک مزاجی کی بارگاہ سے جو انعام مِلا وہ میں نے بسروچشم قبول کیا۔ جونہی میں نے بعض کتابوں کے ادھورے مسودوں کو جو میرے دماغ میں محفوظ تھے قرطاس وقلم کے حوالے کرنا چاہا تو طبیعت کو ہر لحاظ سے مستعد پایا۔۔۔ "حمید نظامی" ہفتہ عشرہ بلکہ اس سے بھی کم مدّت میں تیار ہوگئی۔ مواد ذہن میں تھا فرصتِ تنہائی حاصل ہوگئی۔ قلم آمادہ تھا دو چار نشستوں میں جو معلوم تھا اور جو محسوس کر رہا تھا ان اوراق میں منتقل ہوگیا۔

مَیں نے قلم کے لئے ان لوگوں کا اِنتخاب کیا جو اس دُنیا میں نہیں۔ جن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو چکا ہے اور جو اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔

"شہید سہروردی" ۔ "میاں افتخار الدین" اور "حمید نظامی" تینوں اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب ان سے نہ صلے کی تمنا ہے نہ ستائش کی پروا، نہ تنقید کا خوف ہے نہ احتساب کا خدشہ۔ جو کچھ لکھا ناراضی اور خوشنودی کے محرکات سے ہٹ کر لکھا ہے۔

حمید نظامی کے متعلق قلم اٹھانے کے بہت سے وجوہ تھے۔ بڑا سبب تو صحافت کا موجودہ دَور تھا کہ ؎

چمن میں بلبلوں نے باغباں کی جیب کاٹ لی
نشیمنوں پہ بجلیوں کا کارواں گزر گیا!

اِن حالات میں ان شمعوں کو روشن رکھنا، جو ہماری اندھیری رات کو جگمگاتی رہی ہیں، ایک قومی فریضہ ہے — چونکہ مجھے بھی قلم کی گستاخیوں کا مرتکب گردانا گیا لہٰذا میں نے ایک ہم قلم کی جسارتوں کا ذکر ضروری سمجھا اور صرف اِس خیال سے نظامی مرحوم پر قلم اُٹھایا کہ آئندہ نسلوں کو معلوم ہو کہ ماضی میں جب زبانیں درماندہ ہو گئی تھیں اور قلم مہر بلب یا انگشت بدنداں تھے تو ایک جیتا جاگتا قلم اور اس کی زبان کلمۃ الحق کی پشتیبان تھی۔

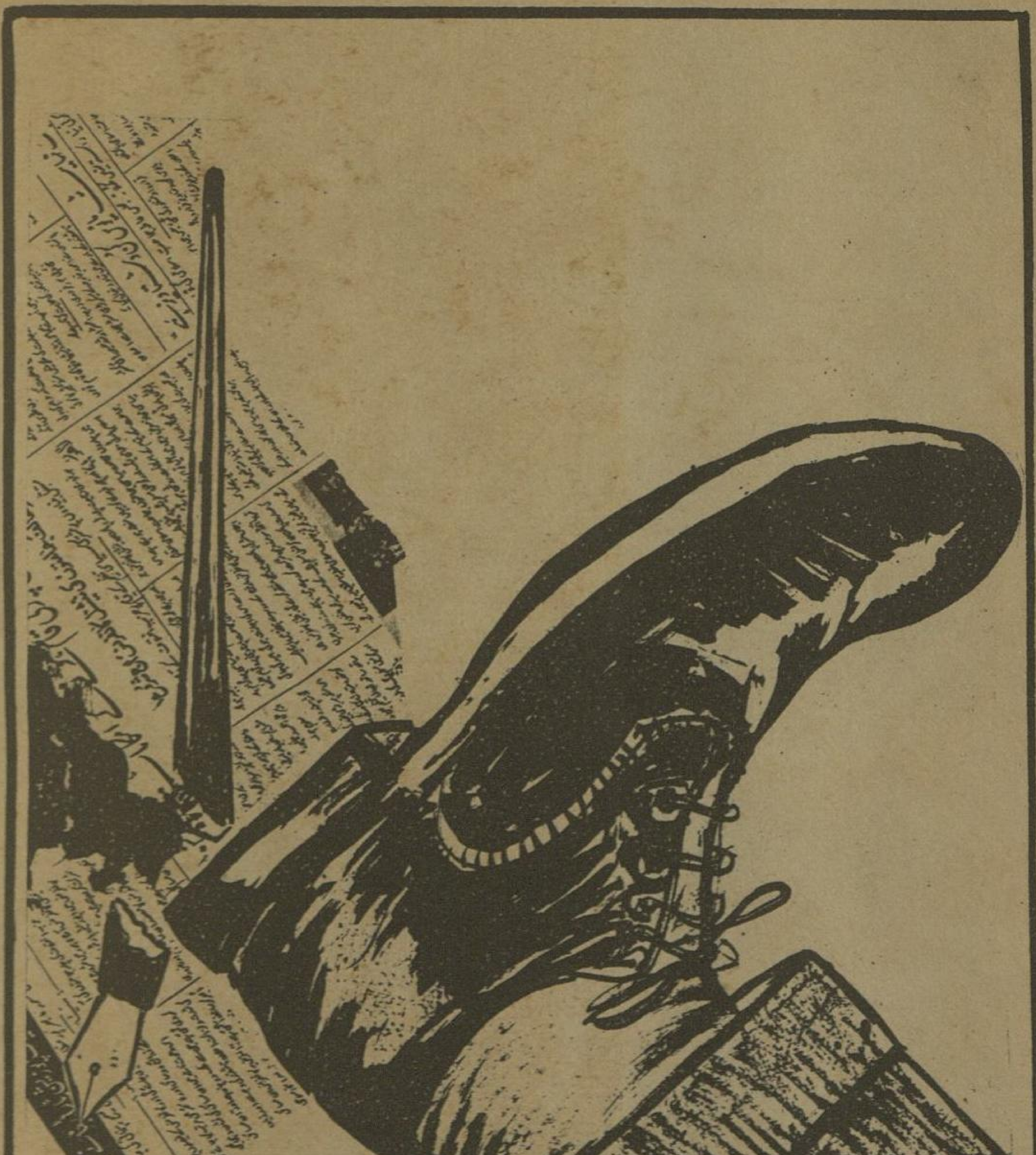
یہ اوراق اس طویل رات کے خلاف نالۂ احتجاج ہیں جس نے قلم کی روشنی کو سلب کیا۔ اور رفتہ رفتہ اخباروں کا مزاج بدل ڈالا۔ اخبار نویسی دانہ و دام کا شکار ہو گئی۔ بہ قول شاد عارفی ؎

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

شورش کاشمیری

لاہور،

۱۳ر فروری ۱۹۶۷ء





شورش کاشمیری کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ
اُس نے اپنی زندگی کے تیس پینتیس برس اُن لوگوں کے
مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں بسر کئے ہیں جنہوں نے
پاکستان اور ہندوستان کی سیاسی، ادبی، قومی، فکری اور
مذہبی تحریکوں کو بال و پر مہیا کئے ——
—— اور جب اُن کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا تو اپنے
پیچھے اس قسم کے نقوشِ پا چھوڑ گئے کہ تاریخ لمبے لمبے
ڈگ بھرتے ہوئے انہی راہوں پر جا رہی ہے۔

حمید نظامی بھی شورش کے مطالعہ و مشاہدہ کا ایک **خاکہ** ہے۔ یہ قلم کے اُس مسا
سرگزشت ہے جس نے اپنے خون سے الفاظ کو تابناک کیا، مطالب کو جِلا بخشی اور افکار کی آبرو رکھی۔
ان اوراق میں شورش کاشمیری نے پاکستان کے اس عظیم صحافی کی سیرت کو اس حسن و خوبی سے پیش کیا
ایک ایک سطر میں کئی کئی کہانیاں اُڑتی پھرتی نظر آتی ہیں۔
انسان کے لئے سب سے مشکل موضوع خود انسان کا مطالعہ ہے۔ اِن اوراق میں یہ مطالعہ کہاں تک کا
رہا، اس بارے میں حتمی رائے وہی لوگ دے سکتے ہیں جنہیں حمید نظامی مرحوم سے ہم سخنی و ہم صحبتی رہی ہے۔ لیک
ان صفحوں میں آگیا ہے وہ بلا شبہ ایک سرگزشت ہے اور اس سرگزشت کے الفاظ و حروف گویا حمید نظامی
خط و خال کا صحیح صحیح عکس ہیں۔

مطبوعاتِ چٹان